محمود، فاروق، فرزانہ کا
اغوا
اشتیاق احمد
Ameed

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود ۰ فاروق ۰ فرزانہ

اور — اِنسپکٹر جمشید سیریز

مُتفرق سلسلہ نمبر ۶۶

محمود، فارُوق، فرزانہ کا اغوا

اشتیاق احمد

نام ناول ۔۔۔۔ محمود، فاروق، فرزانہ کا اغوا
طابع ۔۔۔۔ اشتیاق احمد
کتابت ۔۔۔۔ سعید نامدار
قانونی مشیر ۔۔۔۔ شمیم احمد ایڈووکیٹ
سرورق ۔۔۔۔ محمد مقصود عُنید
مطبع ۔۔۔۔ افضل شریف پرنٹرز
قیمت ۔۔۔۔ ۱۰ روپے

حدیث شریف

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کسی کھانے کی بُرائی نہیں کی (جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے، کہتے ہیں، یہ کھانا بالکل خراب ہے، بدمزا ہے، بدبُودار ہے) اگر وہ پسند آیا تو کھا لیا، نہیں تو اُس کو چھوڑ دیا (یعنی نہ کھایا)

سُنن ابنِ ماجہ شریف، صفحہ نمبر ۵۰
جلد سوم، حدیث نمبر ۱۴۳
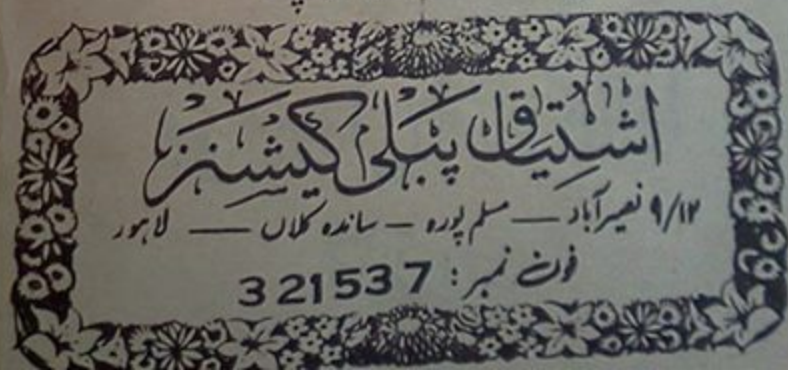
السلام علیکم!

میرے ایک قریبی قاری (جیسے قریبی دوست ہوتے ہیں) نے ایک دن مجھ سے کہا، وہ دن کہاں گئے، جب آپ کے ناولوں میں جاسوسی کہانی ہوتی تھی۔ ایک واردات ہو جاتی تھی اور آپ کے کردار بس اس کے مجرم کا سراغ لگاتے تھے۔ اور اس طرح ناول تمام ہو جاتا تھا۔ ایک کمرے میں واردات ہو جاتی تھی، تو اسی کمرے میں ناول ختم ہو جاتا تھا۔ یا ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ناول کی کہانی مکمل ہو جاتی تھی۔ میں نے جواب میں کہا، وہ دن دراصل ہوا ہو گئے ہیں۔ کہنے لگے، دن بھی ہوا ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ۔ ہونے کو اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت مجھے ان ناولوں کے پروگرام کا

علم نہیں تھا، ورنہ میں کر دیتا۔ مہربان، فکر نہ کریں، آپ کے لیے کچھ پرانی چیزیں نئی کر کے پیش کرنے والا ہوں۔ بہرحال اس پر وہ کہہ سکتے تھے، یہ تو ہم نے پڑھے ہوئے ہیں۔ آپ اس انداز میں نئے ناول لکھیں تاکہ پرانے لگ سکیں۔ آپ ہی بتائیں، میں کروں تو کیا؟

اشتیاق

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

پھنس گئے

وہ عجیب آواز سن کر محمود کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس وقت وہ گھر میں بالکل تنہا تھا۔ انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید ایک عزیز کی بیمار پرسی کے لیے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ ایسے میں فاروق اور فرزانہ کو ایک دوست کی سالگرہ میں جانا پڑ گیا۔ دوست نے بلایا تو تینوں کو ہی تھا لیکن کافی دیر تک لڑنے اور جھگڑنے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ ایک آدمی کو گھر کی نگرانی کے لیے بھی ان تینوں میں سے کسی ایک کو رکنا چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ گھر کون رہے۔ تینوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ قرعہ اندازی کر لی جائے۔ جس کے نام کی پرچی کھلے، وہی گھر میں رہے۔

تین پرچیاں ڈالی گئیں۔ محمود نے آنکھیں بند کر کے ایک پرچی اٹھائی، اسے کھولا تو اس کا نام نکلا۔ اب وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ فاروق اور فرزانہ اس کا مذاق اڑاتے، قہقہے لگاتے گھر سے نکل گئے اور وہ بالکل اکیلا رہ گیا۔ پورے گھر میں سناٹا طاری ہو گیا۔ اس نے گھر کا دروازہ بند کیا۔ اپنے کمرے کی بائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی بند کی اور پھر ڈرائنگ روم میں

آکر ایک صوفے پر لیٹ گیا۔ اب اسے جاسوسی ناول پڑھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ فاروق اور فرزانہ کو رات گئے لوٹنا تھا جب کہ ان کے والدین صبح سویرے آنے والے تھے۔

سردیوں کے دن تھے اور دسمبر کی آخری راتیں، سردی اپنا لوہا منوانے پر تل گئی تھی۔ محمود کو سردی کا احساس ہوا تو اس نے آتش دان میں لگا ہیٹر کا سوئچ آن کر دیا، ہیٹر روشن ہو گیا اور کمرے سے سردی اڑنچھو ہونے لگی۔

یہی وہ وقت تھا جب اس نے وہ عجیب سی آواز سنی تھی۔ ناول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ کان کھڑے ہو گئے۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ پہلا خیال جو اسے آیا، وہ یہ تھا کہ کیا اس کے کان بجے ہیں۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند ہے، کھڑکی بھی بند ہے، گھر کے اندر داخل ہونے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں، پھر بھلا گھر میں کوئی آواز کیسے گونج سکتی ہے۔ پالتو بلی کے کودنے سے تو آواز پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بہر حال وہ آواز بالکل ایسی تھی جیسے کوئی کودا ہو۔ محمود کے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ تیزی سے اٹھا، کمرے سے نکلا اور صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا، دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا، پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا:

"کیا کچھ ہونے والا ہے۔ کیا کوئی خطرہ ہمارے گھر پر منڈلا رہا ہے؟"

اس کے دل نے جواب دیا: "شاید!" اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا، دبے پاؤں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا۔ پھر وہ باورچی خانے میں گیا، وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

اب دیکھنے کے لیے صرف ایک کمرہ رہ گیا تھا اور وہ تھا اس کے والد کا کمرہ۔ پنجوں کے بل چلتا ہوا وہ اس طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے جھانک کر دیکھا۔ اندر کوئی بھی تو نہیں تھا۔ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ دروازے کے پیچھے اور باتھ روم میں ایک نظر ڈالی، مایوسی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

"تو۔ مجھے واقعی وہم ہو گیا تھا!" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

پھر مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ بے خیالی میں صوفے پر بیٹھ گیا اور قالین پر پڑا ہوا ناول اٹھا لیا۔ اب وہ پھر ناول میں محو ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کی اپنی حرکات پر اسے ہنسی آ رہی تھی اور ناول کے ساتھ ساتھ وہ سوچ رہا تھا... ہم تو سچ مچ جاسوس بنتے جا رہے ہیں۔

پھر اچانک ہی اسے سردی کا احساس ہوا۔ اس نے حیران ہو کر آتشدان کی طرف دیکھا اور پھر...... اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کمرے کا بلب روشن تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جو ہیٹر جلایا تھا، اب بجھا پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں فوراً ہی خیال آیا، شاید ہیٹر میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے۔ لیکن...... نہیں...... ہیٹر کا سوئچ تو اٹھا ہوا تھا جب کہ تھوڑی دیر پہلے سوئچ اس نے خود دبایا تھا۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہو گیا۔ یہ حقیقت اس پر روشن ہو گئی کہ اس نے تھوڑی دیر پہلے جو آواز سنی تھی، وہ اس کا وہم نہیں تھا۔ کسی نے ہیٹر کا سوئچ اوپر اٹھایا ——— اس کا مطلب تھا ..... گھر میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔

اس کے ماتھے پر سردی کے عالم میں بھی پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ ناول اس نے آہستگی سے تپائی پر رکھ دیا۔ ایک بار پھر وہ دروازے پر آیا، پھر اپنے کمرے میں گیا، کھڑکی کھول کر باہر جھانکا ——— ہر طرف سناٹا تھا۔ ابھی رات کے صرف نو بجے تھے، لیکن سردی کے موسم میں نو بجے بھی یوں لگتا ہے جیسے آدھی رات کا سماں ہو ——— باہر کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ ہو کا عالم طاری تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ پلٹا۔ اس نے خود سے کہا:

"یار محمود ——— یہ میں آج کس چکر میں پھنس گیا۔ گھر میں کوئی بھوت تو نہیں گھس آیا؟"

بھوت کے خیال پر وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ بھوت پریت پر انہوں نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ اگرچہ کئی کیسوں کے سلسلے میں انہیں آسیب زدہ مکانوں وغیرہ سے واسطہ بھی پڑا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا ..... میں نے چھت کا جائزہ تو لیا ہی نہیں۔

اس خیال کا آنا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چھت بھی سنسان تھی۔ اس نے ایک ایک کونا دیکھ ڈالا۔ پچھلی دیوار پر کوئی پانی کا پائپ بھی نہیں تھا جس سے یہ سوچا جا سکتا کہ شاید کوئی پائپ

کے ذریعے اوپر چڑھ آیا ہو۔ بائیں باغ کا کوئی درخت بھی چھت کی منڈیر تک نہیں پہنچتا تھا، اس لیے اس نے نہ پچھلی دیوار کا جائزہ لیا اور نہ بائیں باغ کے ساتھ والی دیوار کا۔ بس چھت کو غور سے دیکھا اور نیچے اترنے لگا۔

اچانک اس کے قدم رک گئے۔ صحن میں بچھی میز کے سامنے کرسی پر کوئی بیٹھا تھا۔ اس کی کمر محمود کی طرف تھی ——— محمود گرتے گرتے بچا۔ ابھی چند لمحے پہلے جب وہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا تھا تو صحن میں کوئی بھی نہیں تھا اور اس سے پہلے وہ پورے مکان کا جائزہ لے چکا تھا۔ لیکن اسے کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔

محمود نے دیکھا، اس کے جسم پر سیاہ لباس تھا۔ سر پر سیاہ ہیٹ تھا۔ میز کی سطح پر دونوں ہاتھ رکھے وہ اس طرح اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو ——— محمود کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے ذہن کو تیزی سے گردش دی اور سوچا ..... اب مجھے کیا کرنا چاہیے ——— تنہا ہونے کا احساس اس کی رگ رگ میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا: کاش! اس وقت فاروق اور فرزانہ بھی یہاں ہوتے۔ اس صورت میں وہ اس کا مقابلہ بڑی آسانی سے کر سکتا تھا۔ پھر اسے پروفیسر داؤد کے دیے ہوئے کھلونا نما ہتھیار یاد آئے ..... ہتھیار بائیں باغ والے ان کے کمرے میں رکھے تھے اور اب وہ اس اجنبی کے سامنے سے گزرے بغیر اپنے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا ——— دوسرے لفظوں میں وہ کوئی ہتھیار حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

آخر اس نے سوچا ..... اس طرح ہمت ہارنے سے کچھ نہیں ہو گا۔

خود کو پُرسکون رکھ کر آگے بڑھو اور دیکھو کہ یہ کون ہے ـــ کیا چاہتا ہے۔ اور گھر میں کس طرح داخل ہوا ہے ـ یہ سب سے حیران کن سوال تھا ـ کہ اجنبی گھر میں کس طرح داخل ہوا ہے ـــ دروازہ اور کھڑکی تو ابھی تک اندر سے بند تھے ـ تو کیا ـــ یہ شخص ہوا میں اڑتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے ـ یا پھر یہ کوئی جادوگر ہے ـ کہیں یہ سچ مچ کوئی بھوت ہی تو نہیں ـــ

سر کو ایک زوردار جھٹکا دے کر اس نے ان خیالات سے پیچھا چھڑایا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ ایسے میں اس نے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنی ـــ اور پھر وہ چلتے چلتے ایک دم اس کے سامنے پہنچ گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ کئی فٹ اونچا اچھل گیا ـــ مارے خوف کے اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں ـــ

کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے دیکھا اس شخص کے چہرے پر ایک بے رحم اور سفاک مسکراہٹ تھی ـ ایسی مسکراہٹ جو بہادر سے بہادر آدمی کا پتہ پانی بنا دینے کے لیے کافی تھی۔

فاروق اور فرزانہ اپنے دوست طاہر احمد کے گھر پہنچے۔ پورا گھر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ طاہر احمد دروازے کے اندر تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ دوستوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ طاہر احمد انہیں دیکھ کر کھل اٹھا۔ اس نے فاروق سے ہاتھ ملاتے

ہوئے فرزانہ سے کہا:

"کیسی ہو بہن!"

"ٹھیک ہوں ـــ" فرزانہ مسکرائی۔

"ارے! محمود نہیں آیا؟" طاہر احمد کے مُنہ سے نکلا۔

"امی ابو گھر میں نہیں تھے، اسے گھر کی حفاظت کے خیال سے چھوڑ کر آنا پڑا۔" فاروق نے کہا۔

"لیکن اس نے یہ منظور کیسے کر لیا؟" طاہر احمد نے پوچھا۔

"قرعہ اندازی کے ذریعے۔" فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے ابو کہاں ہیں ـــ ان سے ملے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا۔" فاروق نے کہا۔

"وہ نہانے گئے تھے ـ نہ جانے ابھی تک کیوں نہیں آئے ـ آؤ میں تمہیں ان کے پاس لے چلتا ہوں۔" طاہر احمد بولا۔

وہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ طاہر احمد کے والد خاور احمد ایک بہت مشہور نقشہ نویس تھے۔ لمبے چوڑے اور سانولے سے رنگ کے آدمی تھے۔ ان سے بہت خوش ہو کر ملتے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ تینوں کئی مرتبہ ان کے گھر آ چکے تھے۔ لیکن سالگرہ کے موقع پر آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ خود طاہر اور اس کے والد بھی دو تین مرتبہ ان کے گھر آ چکے تھے۔ انسپکٹر جمشید بھی ان سے واقف تھے۔

"ارے! ابا جان تو ابھی تک نہا رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں — آؤ ہم چلیں — باہر ہی مل لیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"نہیں — ہم یہیں ٹھہرتے ہیں — ان سے اسی کمرے میں ملواؤں گا۔"
طاہر نے کہا اور وہ وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ غسل خانے میں برابر پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ نہ جانے کیوں فرزانہ پریشان ہو گئی۔

"طاہر بھائی .... ذرا غسل خانے کے دروازے پر جاکر اپنے ابو کو آواز تو دیں۔"

"کیوں!" طاہر نے حیران ہو کر کہا۔

"پہلے آواز دیں — پھر وجہ بتاؤں گی۔"

طاہر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر غسل خانے کے دروازے پر جاکر آواز دی۔

"ابو —!"

کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے فرزانہ اور فاروق کی طرف دیکھا اور پھر ذرا بلند آواز میں آواز دی۔

"ابو — کیا آپ نہا چکے —"

"بس بیٹے — ابھی آتا ہوں —" اندر سے آواز آئی۔

طاہر مطمئن ہو کر واپس پلٹا اور فرزانہ سے بولا: "ہاں فرزانہ بہن! اب بتاؤ — کیا بات تھی۔"

"کچھ بھی نہیں .... مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے غسلخانے میں کوئی نہ ہو — لیکن میرا خیال غلط تھا۔"

"مگر تمہیں ایسا محسوس کس طرح ہوا؟" طاہر ابھی تک حیران تھا۔

"چھوڑو یار .... اس کی تو عادت ہے بات بے بات کچھ نہ کچھ محسوس کرتی رہتی ہے۔"

اس وقت کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ طاہر نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر فاروق کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

"تمہارا فون ہے۔"

"میرا — بھلا مجھے یہاں کون فون کر سکتا ہے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

ساتھ ہی اس نے ریسیور کان سے لگایا پھر اس طرح اچھلا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔

بیگم جمشید غائب

انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید گاڑی سے اتر کر ایک ٹیکسی کے ذریعے اپنے عزیز کے گھر پہنچے۔ عزیز کا نام اعجاز احمد تھا اور وہ ان کے رشتے کے چچا تھا۔ انہی کی وفات کی خبر سن کر انہیں یہاں آنا پڑا تھا۔ اعجاز احمد کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے حیرت بھری نظر ادھر اُدھر ڈالی۔ رات کافی ڈھل چکی تھی، لیکن پھر بھی گھر کے اندر روشنی ہونی چاہیے تھی۔ جس گھر میں کوئی فوت ہو جائے، وہاں کے سب لوگ اس طرح تو نہیں سو جاتے کہ پورے گھر میں کوئی ہل چل نظر نہ آئے۔ یہاں عالم یہ تھا کہ پورا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے گھر والے گھوڑے بیچ کر سوئے ہوں۔

آخر انہوں نے بے تابی کے عالم میں دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کہیں جا کر اندر روشنی ہوئی۔

"معلوم ہوتا ہے، ہم کسی چکر میں پھنس گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟" بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

ابھی انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور پھر وہ

دھک سے رہ گئے ۔۔۔ ان کے چچا اعجاز احمد ان کے سامنے کھڑے تھے۔ اور گھور گھور کر انہیں دیکھ رہے تھے۔

"جمشید ۔۔۔ یہ تم ہو۔" ان کی آواز میں بلا کی حیرت تھی۔

"جی ہاں ۔۔۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام ۔۔۔ خیر تو ہے۔"

"شاید ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور جلدی جلدی ساری بات انہیں بتا دی۔ اعجاز احمد نے بوکھلا کر خود کو ٹٹولا کہ کہیں وہ سچ مچ مر ہی تو نہیں چکے۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ ۔۔۔ خطرہ ضرور سروں پر منڈلا رہا ہے۔ کیا یہاں کہیں سے ٹرنک کال ہو سکتی ہے۔"

"ٹرنک کال ۔۔۔ ہاں کیوں نہیں ۔۔۔ میں گھر میں فون لگوا چکا ہوں۔"

"اوہ ۔۔۔ تو پھر جلدی کیجیے۔"

اعجاز احمد انہیں ساتھ لے کر فون کے پاس آئے۔ انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی محمود اور فاروق کے دوست طاہر کے والد خاور احمد کے گھر کے نمبر بتا کر کال بک کروائی اور انتظار کرنے لگے۔ بیگم جمشید کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ دوسری طرف اعجاز احمد گھر کے دوسرے افراد کو جگا چکے تھے۔ گھر کی عورتیں بیگم جمشید کے پاس پہنچ گئی تھیں ۔۔۔ اچانک انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"محمود ..... گھر میں اکیلا ہے — فاروق اور فرزانہ خاور احمد کے
گھر پارٹی میں ہوں گے۔ ہم یہاں ہیں، اس کا صاف مطلب ہے کہ محمود
خطرے میں ہے — اف خدا — تم ..... مگر یہ کیسے ممکن ہے ....."

"کیا کیسے ممکن ہے — آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" بیگم جمشید الجھ
کر بولیں۔

"جس نے بھی ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہے، اسے یہ تو معلوم
ہو سکتا ہے کہ ہم حافظ آباد روانہ ہو جائیں گے، لیکن اسے یہ کس طرح معلوم ہو
گیا کہ عین اسی دن، اسی وقت فاروق اور فرزانہ پارٹی میں جائیں گے —
آخر یہ کیسے ممکن ہے — بہر حال یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پروگرام
بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے۔ نجانے وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔"

"خدا خیر کرے۔"

عین اسی وقت نمبر مل گیا۔ انہوں نے کہا:

"ہیلو — فاروق ..... میں حافظ آباد سے بول رہا ہوں — تم دونوں
فوراً گھر پہنچو — محمود خطرے میں ہے۔"

"جی!" دوسری طرف سے فاروق کے منہ سے نکلا، لیکن انسپکٹر جمشید وقت
ضائع نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور اعجاز احمد سے معذرت
کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔ اعجاز احمد ان کے پیچھے پیچھے آئے اور
بولے:

"لیکن اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی، نہ کوئی بس جاتی ہے۔"

"تو پھر — اب کیا کیا جائے — میرا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"اس کا اب صرف ایک ہی حل ہے۔ میری موٹر سائیکل لے جائیں۔"

"ٹھیک ہے — لیکن کیا اس میں اتنا پٹرول ہو گا۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتا — پرسوں ڈلوایا تھا — لیکن میرے پاس
اس کا بھی حل ہے — پٹرول کا ایک گیلن گھر میں موجود ہے۔"

"بہت خوب — تو پھر ذرا جلدی کیجئے۔"

چند منٹ بعد انسپکٹر جمشید بیگم جمشید کے ساتھ موٹر سائیکل پر اڑے جا
رہے تھے۔ اس سڑک پر سفر کرنے کا یہ ان کا پہلا اتفاق تھا۔ سڑک کے
دونوں طرف گھنے جنگل تھے، لیکن انسپکٹر جمشید ہر خطرے سے بے نیاز
پوری رفتار سے موٹر سائیکل لیے جا رہے تھے۔ انہیں اس بات کا بھی فکر
نہیں تھا کہ اگر پٹرول ختم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ کیونکہ پٹرول کا ایک گیلن کیریر
پر رکھا تھا۔

اچانک ان کی نظر دور ..... بہت دور سڑک پر پڑی۔ موٹر
سائیکل کی ہیڈ لائٹس میں انہوں نے اس موٹے سے رستے کو صاف دیکھا
تھا جو سڑک کے آر پار شاید دو درختوں سے بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے یکلخت بریک
لگا دیے۔

"کیا ہوا — ؟" بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

"خطرہ — !" انہوں نے کہا: "ہم گھر گئے ہیں اس جال کا گھیرا
لحظہ بہ لحظہ تنگ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے غلط اندازے لگائے تھے۔ یہ پورا

پروگرام بڑے زبردست دماغ نے تیار کیا ہے۔"

"لیکن یہاں خطرہ کہاں ہے؟" بیگم جمشید نے پوچھا۔

"وہ دیکھو...... سامنے سڑک پر رسا بندھا ہے۔"

"اوہ! تو ان کے منہ سے نکلا۔

"اور اب تو میں سوچ رہی ہوں کہ میں نے فاروق اور فرزانہ کو گھر بھیج کر بھی غلطی کی ہے — ضرور انہیں بھی راستے میں گھیرا جائے گا۔"

"اُف خدا — یہ سب کیا ہے — تین طرف سے حملہ —" بیگم جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

"ہمت ہارنے سے کچھ نہیں ہوگا — ایسے موقعوں پر خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے عقل اور ہوش سے کام لینا چاہیے۔"

"لیکن یہاں نظر تو کوئی نہیں آتا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے جن لوگوں نے رسا باندھا ہے، وہ یہاں نہیں ہوں گے — وہ یہیں ہیں۔ لیکن ہم چونکہ کافی دُور رُک گئے ہیں، اس لیے وہ ابھی سامنے نہیں آئے۔"

"تو پھر چلیے — واپس چلتے ہیں —" بیگم جمشید نے تجویز پیش کی۔

"واپس..... نہیں — واپس تو اب نہیں جائیں گے — محمود، فاروق اور فرزانہ کی زندگی بھی خطرے میں ہے اور اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ہماری زندگی کس کام کی —"

"پھر آپ کیا کریں گے؟"

"ہم آگے بڑھیں گے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا آپ کے پاس پستول ہے۔"

"بھلا کسی کی وفات کی خبر سن کر بھی کوئی پستول لیکر چلا کرتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ — پھر آپ ان لوگوں سے کیسے مقابلہ کریں گے۔"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" انہوں نے کہا اور موٹر سائیکل چلادی۔

اب وہ درمیانی رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ بیگم جمشید کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ انہیں اپنا نہیں، محمود، فاروق اور فرزانہ کا فکر کھائے جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر ہم اس جنگل سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو بچوں کا کیا بنے گا۔

موٹر سائیکل رسے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ انسپکٹر جمشید نے اِدھر، اُدھر دیکھا — کسی طرف دشمن کے آثار نظر نہ آئے۔ اب تو وہ بہت حیران ہوئے۔ وہ موٹر سائیکل سے اُتر آئے اور دائیں طرف والے اس درخت کی طرف بڑھے جس سے رسا بندھا تھا۔ انہوں نے دیکھا — وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ حیران رہ گئے۔ پھر جونہی وہ رسا کھول کر مڑے، ان کی سٹی گم ہو گئی۔ ابھی چند لمحے پہلے موٹر سائیکل سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی، جس پر بیگم جمشید بیٹھی تھیں، لیکن اب..... اب بیگم جمشید وہاں نہیں تھیں۔

فون کا ریسیور کان سے لگاتے ہی فاروق بُری طرح اُچھلا تو فرزانہ
حیران رہ گئی۔ اس نے گھبرا کر کہا:
"کیا ہوا فاروق ___ کیا ریسیور میں کرنٹ دوڑ گیا ہے یا اندر سے
کسی بچھّو نے ڈنک مار دیا ہے؟"
فاروق نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو فون پر کسی کی
بات سن رہا تھا۔ آخر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس دم فرزانہ کو اس کا چہرہ
زرد زرد لگا۔ اس نے بوکھلا کر کہا:
"کیا ہوا فاروق، بتاتے کیوں نہیں۔"
"محمود خطرے میں ہے ___ اٹھو . . . . جلدی کرو۔"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو فاروق۔" طاہر احمد نے گھبرا کر کہا۔
عین اسی وقت غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ انہوں نے دیکھا، طاہر کے
والد خاور احمد نہانے کے بعد غسل خانے سے باہر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں
تولیہ تھا جس سے وہ اپنے سر کے بال خشک کر رہے تھے۔
"ہمیں افسوس ہے انکل . . . . ہم آج کی پارٹی میں شریک نہیں
ہو سکیں گے۔ ابھی ابھی فون آیا ہے، ہمارے بڑے بھائی محمود خطرے
میں ہیں ___ خدا حافظ۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا اور جواب کا انتظار
کیے بغیر باہر کی طرف دوڑا۔ فرزانہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ خاور احمد
دونوں کو گھورتے ہی رہ گئے۔
سڑک پر پہنچ کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا ___ دُور دُور تک کسی

ٹیکسی یا رکشے کا پتا نہیں تھا ___ فرزانہ نے جلدی سے کہا:
"اب کیا کریں فاروق؟"
"دوڑ لگاتے ہیں۔" فاروق بولا۔
"ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے کہا اور دونوں تیزی سے دوڑنے لگے۔
فرزانہ ہر سال سکول کے دوڑوں کے مقابلے میں اوّل آتی تھی اور فاروق
ہاکی کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس لیے ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایک میل کا
فاصلہ انہوں نے تقریباً پانچ منٹ میں طے کر لیا۔ اب وہ گھر کے سامنے پہنچے
یہاں پہنچ کر وہ رک گئے۔ انہوں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ
نہیں تھی۔
"کہیں وہ فون کسی نے مذاق میں تو نہیں کیا۔" فرزانہ نے کہا۔
"کیا کہتی ہو ___ فون ابا جان کا تھا ___ حافظ آباد سے ٹرنک کال
تھی۔"
"کیا ___!" فرزانہ دھک سے رہ گئی پھر بولی "مگر حافظ آباد میں
انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ محمود خطرے میں ہے؟"
"میں کیسے بتا سکتا ہوں۔" فاروق نے جھنجلا کر کہا۔
"عقل سے کام لے کر۔" فرزانہ مسکرائی۔
"اگر تمہاری عقل کام کرتی ہے، تو تم بتا دو۔" فاروق نے منہ بنایا۔
"ابا جان کو جب چچا کی وفات کی خبر ملی تھی، ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں
اپنے گھر میں زندہ ملے ہوں اور اس سے انہوں نے اندازہ لگایا ہو کہ محمود خطرے

میں ہے کیونکہ گھر میں وہی رہ گیا تھا۔"

"ہو سکتا ہے، تمہارا خیال ٹھیک ہو، لیکن یہ وقت خیالی گھوڑے دوڑانے کا نہیں ہے۔"

"لیکن یہاں تو ہر طرف خیریت نظر آتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"آؤ بھی تو —"

دونوں دروازے پر پہنچے۔ ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا، دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ پائیں باغ میں پہنچے۔ پائیں باغ کی کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔ آخر دوبارہ دروازے پر آ کر فاروق نے مخصوص انداز میں گھنٹی بجائی۔ گھنٹی بجانے کے اس انداز کا محمود کو بخوبی علم تھا لیکن چند منٹ گزرنے پر بھی دروازہ نہ کھلا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ اندر گڑبڑ ضرور ہے۔" فاروق نے کہا۔

"پھر — اب کیا کریں؟"

"ہمیں کسی نہ کسی طرح گھر کے اندر پہنچنا ہے۔" فاروق بولا۔

"یہ ہمارا گھر ہے۔ اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اندر جانے کے صرف دو راستے ہیں۔ ایک دروازہ، دوسری کھڑکی — اس کے علاوہ گھر کے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

"اس کے باوجود ہمیں اندر جانا ہے۔" فاروق بولا۔

"تو پھر چلو — دیوار توڑ کر یا دروازہ توڑ کر اندر چلتے ہیں۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"انگارے نہ چباؤ — منہ جل جائے گا۔ صرف یہ سوچو کہ ہم اندر کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"تو پھر آؤ... پائیں باغ کا جائزہ لیتے ہیں — شاید کسی درخت سے کام بن جائے۔"

دونوں پھر پائیں باغ میں پہنچے اور ایک ایک درخت کا جائزہ لینے لگے۔ اس نظریے سے انہوں نے پہلے کبھی درختوں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ ایک درخت دیوار سے بہت قریب تھا۔ اس کے نیچے پہنچ کر انہوں نے اوپر دیکھا۔

"ارے — یہ کیا ہے؟" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"کہاں —" فاروق نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ دیکھو... اس درخت سے دیوار تک ایک تار سا کھنچا نظر آ رہا ہے۔"

فاروق نے غور سے دیکھا۔ تاروں کی روشنی میں اسے ایک باریک سا تار دکھائی دیا جو منڈیر تک چلا گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے، یہ دھاگا ہو..... شاید کسی بچے کی پتنگ کی ڈور ہو۔"

"لیکن مجھے یہ تار ڈور سے موٹا نظر آتا ہے۔ کیوں نہ ہم درخت پر چڑھ کر اس کا جائزہ لیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

پہلے فاروق نے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ اس کے پیچھے ہی فرزانہ بھی چڑھ گئی۔ تینوں درختوں پر چڑھنے کے ماہر تھے لیکن جو مہارت فاروق کو تھی، وہ ان دونوں میں بھی نہیں تھی۔ اوپر پہنچنے میں فاروق کو صرف ڈیڑھ

منٹ لگے۔ وہ اس تار تک پہنچ گیا تھا۔ اچانک فرزانہ نے اس کی حیرت میں ڈوبی آواز سُنی۔

"ارے! یہ تو نائیلون کی رسّی ہے!"

ایک اور چال

کُرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے محمود کو اُچھلتے دیکھ کر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ بے رحم مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔ آخر اس نے کہا

"کیوں! ڈر گئے"

"نہیں ڈرا تو نہیں..... چونکا ضرور ہوں۔ مگر سمجھ نہیں سکا — یہ سب کیا ہے" محمود نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں...... بس اپنا شوق پورا کر رہا ہوں" اس نے ہنس کر کہا۔

"شوق — کیا مطلب — کیسا شوق ہے؟" محمود نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"میرے شوق عجیب و غریب ہیں۔ بہت جلد تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سب کیا ہے"

"بہت اچھا — اب کیا پروگرام ہے" محمود نے لاپروائی ظاہر کرنے کیلئے کندھے اُچکائے حالانکہ وہ بہت فکرمند تھا کیونکہ اس کے ابا جان حافظ آباد گئے ہوئے تھے جو صبح سے پہلے واپس نہیں آسکتے تھے۔ فاروق اور فرزانہ

طاہر کی سالگرہ میں گئے تھے، وہ بھی رات کے گیارہ بجے سے پہلے واپس آنے والے نہیں تھے۔ ان حالات میں وہ گھر میں تنہا رہ گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص چاہتا کیا ہے۔ یہ سب باتیں اسے فکرمند کیے دے رہی تھیں۔

"پروگرام۔۔۔ ہاں — پروگرام تو بہت زوردار ہے — ایسا کہ تم سن کر اچھل پڑو گے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"میں اچھلنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ اگر نہ اچھل سکا تو کوئی اور پروگرام سنا دیجیے گا۔" محمود مسکرایا۔

"نہیں تم ضرور اچھلو گے۔"

"اچھا جناب! اچھل لوں گا۔" محمود نے مسمی صورت بنا کر کہا۔

"چلو — تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔" اس نے اس طرح کہا جیسے گھر کا ہی کوئی فرد ہو۔

"وہاں جا کر کیا کریں گے؟"

"یہ وہاں جا کر ہی بتاؤں گا — اور یہ بھی بتا دوں، اگر کوئی شرارت کرنے کی تمنا ہے، تو ضرور کرو، کہیں تمہارے دل میں حسرت نہ رہ جائے کہ ہم نے تمہیں کوئی موقع نہیں دیا۔"

"کیسی شرارت؟" محمود نے انجان بن کر کہا۔

"شرارت جیسے بھی ہو — پھر آؤ۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا قد لمبا تھا، جسم کا رنگ سرخی مائل سیاہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ چہرہ

بالکل گول تھا، البتہ ناک بہت لمبی تھی۔ وہ اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ محمود نے سوچا، موقع اچھا ہے، خود اس نے اجازت دی ہے، اس لیے ایک کوشش کر کے دیکھ ہی لی جائے۔ یہ سوچتے ہی وہ اس کے پیچھے چل پڑا، پھر جونہی وہ کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچے، محمود اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کی گردن کے ساتھ لٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں بازو گردن کے گرد کسنے شروع کر دیے۔

"بہت خوب! تو تم شرارت کر ہی گئے — میرا خیال تھا، خود میری طرف سے دعوت ملنے کے بعد تم اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کرو گے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے گھومنے لگا — اس کے ساتھ محمود بھی گھوم رہا تھا، اس طرح کہ اس کی ٹانگیں فرش کے متوازی ہو گئی تھیں۔ اچانک وہ خوفناک آدمی گھومتے گھومتے رک گیا اور سر کو ایک زوردار جھٹکا مارا — محمود کے بازو اس کی گردن سے ہٹ گئے اور وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوا۔ پھر بیٹھا ہی رہ گیا، اٹھ کر کھڑا نہ ہو سکا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جوڑ جوڑ الگ ہو گیا ہو۔ وہ حیران تھا کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔ اس کے بازو اس شخص کی گردن سے کیوں الگ ہو گئے۔ اس نے جھلاہٹ بھری ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ اب تک کراہ رہا تھا:

"بس۔۔۔ یا کچھ اور؟" اس نے للکارنے والے انداز میں کہا۔

"جو میں کر سکتا تھا، کر چکا — آپ نے خود ہی تو اجازت دی تھی۔" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

"ہاں ۔۔۔ یہ ٹھیک ہے ۔۔۔ اب اٹھو اور گھر چلو۔"

"لیکن ۔۔۔۔ لیکن مجھ سے نہیں اٹھا جا رہا۔" اس نے کہا۔ لہجے میں بے بسی تھی۔

"ارے! ابھی تو تم نے میرے اوپر چھلانگ لگائی تھی۔ اور اب تم سے اٹھا بھی نہیں جا رہا۔"

"نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"ٹھہرو ۔۔۔ میں تمہیں اٹھاتا ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر محمود کو سہارا دیا۔ محمود چند قدم چلا اور پھر دھڑام سے گر پڑا۔ وہ بالکل بے ہوش ہو چکا تھا۔

۔۔۔۔ ٭ ۔۔۔۔

انسپکٹر جمشید پاگلوں کی طرح چلا اٹھے۔

"بیگم تم کہاں ہو؟"

جنگل کے سناٹے میں ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔ انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ وہ دوڑتے ہوئے موٹر سائیکل کے پاس پہنچے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ بیگم جمشید اس وقت ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کہیں موجود ہوں، لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس سمت میں آگے بڑھتے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ جنگل میں کہاں اور کس سمت میں ہوں گی اور کس حال میں ہوں گی۔ انہوں نے ایک بار پھر انہیں آواز دی۔ ان کی آواز درختوں سے سر ٹکرا ٹکرا کے ناکام لوٹ آئی۔ آخر وہ اندھا دھند

ایک طرف بڑھنے لگے۔ وہ ہر جھاڑی اور درخت کے پیچھے دیکھتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اور بھی ان کے بالکل قریب موجود ہو ۔۔۔ کئی بار انہوں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا، لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔

کافی دور جا کر انہوں نے سوچا، "شاید میں غلط سمت میں نکل آیا ہوں۔" وہ پلٹے اور سڑک کا رخ کرنے کی بجائے جنگل میں ایک اور سمت میں بڑھنے لگے۔ ان کا دل ڈوب ڈوب جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ "جس کسی نے بھی یہ منصوبہ بنایا ہے، وہ بہت تیز دماغ کا مالک ہے۔ وہ کب کوئی چال چلے گا، پہلے سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کی چال تو اس وقت ہی سمجھ میں آتی ہے جب وہ چال چل چکا ہوتا ہے۔ اس وقت بھی اس نے اپنی عقل کے ذریعے مجھے تگنی کا ناچ نچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں رستہ کھولنے کے لیے درخت کے قریب گیا، اور اس نے بیگم کو غائب کر دیا ۔۔۔ حیرت انگیز طور پر چالاک آدمی سے واسطہ پڑ گیا ہے اس مرتبہ۔"

چند منٹ کے اندر اندر انہوں نے سڑک کے آس پاس کا تمام جنگل دیکھ ڈالا مگر بیگم جمشید کا کہیں نشان نظر نہ آ سکا۔ وہ پھر سڑک کی طرف آئے اور دوسری طرف کے جنگل میں گھس گئے۔ وہ نہتے تھے اور کسی بھی طرف سے دشمن کی گولی آ کر ان کا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ مگر بیگم کی گمشدگی نے انہیں ہر احتیاط سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ اندھا دھند ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، ایسے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی زہریلا کیڑا انہیں کاٹ کھاتا، لیکن انہوں نے

اس کی بھی پروا نہیں کی اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

اِس مرتبہ وہ جوش میں کچھ زیادہ دُور نکل آئے، لیکن شاید یہی ان کی غلطی تھی، کیونکہ انہوں نے عین اسی وقت موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح مڑے اور سڑک کی طرف دوڑے۔

آندھی اور طوفان کی طرح دوڑتے، وہ درختوں اور جھاڑیوں سے خود کو بچاتے وہ سڑک کے کنارے پہنچے تو وہاں موٹر سائیکل نہیں تھی۔

چالاک ترین دشمن ان سے ایک اور چال چل گیا تھا۔

رسّی پر

نایلون کی رسی کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ کئی سیکنڈ تک ان دونوں کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔ وہ ٹک ٹک رسی کو گھورتے رہے۔ رسی تنی ہوئی تھی۔ اس کا ایک سِرا درخت کی ایک شاخ سے بندھا تھا اور دوسرا سِرا منڈیر کے پیچھے غائب تھا . . .

"لیکن یہاں اس رسّی کا کیا کام؟" آخر فرزانہ نے کہا۔

"پوچھو رسی سے . . . . مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"یہ وقت مذاق کا نہیں ہے۔"

"ہاں — یہ تو درخت پر چڑھنے اور پھر اس رسی کے ذریعے چھت پر پہنچنے کا وقت ہے۔" اس نے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے، شاباش . . . جلدی کرو . . . . اس رسی پر لٹکتے ہوئے منڈیر تک پہنچ جاؤ۔ میں بھی تمہارے پیچھے آتی ہوں۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"اور رسی میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تو میرے پیچھے آنا نہ بھولنا۔"

فاروق بُری طرح جھلّایا ۔ دانت

"فکر نہ کرو — تم چلو تو سہی۔"

آخر فاروق شاخ سے اتر کر رسی کے ساتھ لٹکنے لگا۔ اب وہ دونوں بازوؤں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے وزن کی وجہ سے رسّا درمیان میں سے نیچے ہو گئی تھی اور چونکہ نائیلون کی تھی، اس لیے ہاتھ پھسل پھسل جا رہے تھے۔ فاروق کو یہ کام بہت مشکل لگا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا... اس سے تو پانی کے پائپ پر چڑھنا آسان ہے۔

پانچ منٹ بعد وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور منڈیر اس سے چند ہاتھ آگے تھی۔ فرزانہ سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس طریقے سے منڈیر تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے فاروق منڈیر پر پہنچ گیا۔ اس نے سانس درست کرتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

"فرزانہ! تم وہیں رہو — تمہارے لیے یہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہوگا۔"

"مگر میں یہاں رہ کر کیا کروں گی۔ نہیں... میں تمہارے ساتھ نیچے چلوں گی — نہ جانے محمود پر کیا گزر رہی، اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا کہ دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔"

"اچھا تو پھر آؤ۔"

فرزانہ بسم اللہ پڑھ کر رسی کے ساتھ لٹک گئی۔ اس قسم کا موقع اس کی زندگی میں پہلی بار آیا تھا — درختوں اور پانی کے پائپوں پر چڑھنے کا اتفاق تو اکثر ہوا تھا۔ رسی پر لٹکے ہوئے اس نے ایک نظر نیچے ڈالی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کافی اونچائی پر تھی ایسے میں اگر رسی اس کے

ہاتھوں سے نکل جاتی تو شدید چوٹ یقینی تھی کیونکہ درمیان میں درخت کی شاخیں تھیں وہ ان میں الجھتے ہوئے نیچے گرتی۔

"نیچے نہ دیکھو —" فاروق نے اسے منع کیا اور اس نے فوراً سر اوپر کر لیا۔ وہ ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھنے لگی۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے رسی درخت کی شاخ پر سے کھسک رہی ہو۔ اس نے گھبرا کر درخت کی طرف دیکھا — شاید رسی کی گرہ ڈھیلی ہو گئی تھی اور وہ اس جگہ سے کھسک کر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فرزانہ نیچے جھکنے لگی۔

"ارے — یہ کیا ہوا۔"

"رسی درخت کی شاخ سے آگے کھسک رہی ہے۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"اوہ — اگر گرہ کہیں اٹک نہ گئی تو کیا ہوگا۔" فاروق کو یوں لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" فرزانہ مسکرائی۔

اسی وقت رسی کا کھسکنا بند ہو گیا۔ اس کی گرہ شاید کسی گانٹھ کی وجہ سے رک گئی تھی، لیکن اب فرزانہ اتنا نیچے جھک گئی تھی کہ اس کے لیے رسی کے ذریعے اوپر کی طرف بڑھنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر رسی کو اوپر سے پکڑتی مگر چکنی رسی پر سے ہاتھ پھسل کر پھر وہیں آ جاتا، اور اس طرح پورے تین منٹ کی بھرپور کوشش کے بعد بھی فرزانہ اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھ سکی۔ فاروق کا مارے گھبراہٹ کے برا حال تھا، اس نے کہا۔

"ٹھہرو فرزانہ... میں تمہیں کھینچتا ہوں۔" اس نے رسی کی طرف ہاتھ

بڑھایا۔ یہ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ منڈیر والے سرے پر لوہے کا ایک آنکڑہ
بندھا ہوا تھا اور یہ منڈیر سے چپٹا ہوا تھا۔ آنکڑے کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا
"نہیں فاروق ــــ ایسا نہ ہو کہ مجھے کھینچتے کھینچتے تم نیچے آ رہو۔" فرزانہ
نے کہا۔

"اللہ مالک ہے ــــ اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔"

"تم میری فکر نہ کرو ــــ نیچے جا کر محمود کی خبر لو۔" فرزانہ جھلا اٹھی۔

"نہیں ــــ میں تمہیں اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ محمود کے ساتھ
تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو بھی چکا ہوگا، لیکن تم اس طرح کب تک لٹکی رہو گی۔"

یہ کہہ کر فاروق نے رسی کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اسے اوپر
کھینچنے لگا۔ فرزانہ کافی وزنی تھی۔ فاروق کو پیر جما کر پورا زور لگانا پڑا، اگر اس
کے پیر اکھڑ جاتے تو وہ سیدھا نیچے جا گرتا۔

اور پھر رسی سیدھی ہو گئی۔ فاروق نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"آؤ فرزانہ ــــ جلدی کرو ــــ رسی اب بالکل سیدھی ہے۔ میں نے اسے
پکڑ رکھا ہے۔"

فرزانہ پھر ایک ہاتھ کر کے آگے بڑھنے لگی۔ آخر اس کا دایاں ہاتھ
فاروق کے ہاتھ تک پہنچ گیا۔ فاروق نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔
اب فرزانہ نے دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ فاروق نے رسی چھوڑ دی اور فرزانہ
کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اب وہ اس کے ہاتھوں میں لٹک رہی تھی۔ دونوں
کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ وہ ہانپ رہے تھے۔

"ہمت کرو فرزانہ ــــ میں تمہیں اوپر کھینچتا ہوں۔"

"شکریہ فاروق۔" فرزانہ نے غمزدہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

فاروق نے اپنی پوری طاقت جیسے بازوؤں میں سمیٹ لی اور فرزانہ کو
اوپر اٹھانے لگا۔ پھر جونہی فرزانہ کے ہاتھ منڈیر تک پہنچے، اس نے اس
کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا۔ فرزانہ نے اس سے منڈیر تھام لی۔ اب مسئلہ آسان تھا
دوسرے ہی لمحے وہ اپنی چھت پر کھڑے ہانپ رہے تھے۔

"اگر اس وقت محمود خطرے میں نہ ہوتا تو ہم چھت پر لیٹ کر اپنے سانس
درست کرتے۔" فرزانہ نے کہا۔

"تم لیٹ جاؤ ــــ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں فاروق ــــ ہم دونوں ساتھ ہی جائیں گے ــــ آؤ چلیں۔"

دونوں لڑکھڑاتے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگے۔ صحن میں انہیں کوئی
نظر نہ آیا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کسی گڑبڑ کے آثار نہیں تھے۔ دونوں
نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر فاروق اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔
فرزانہ اس کے پیچھے تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا

انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اندر گھس گئے اور پھر بڑی زور سے اچھلے
محمود اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ زرد تھا۔ دونوں
تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

"محمود..... محمود..... تمہیں کیا ہوا؟" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

فاروق نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ فرزانہ نے دل کی دھڑکن سننے

کے لیے اُس کے سینے پر کان رکھ دیا۔

"یہ صرف بے ہوش ہوا ہے ___ فکر نہ کرو۔"

ایک کھنک دار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ دونوں گھبرا کر مڑے، لیکن مڑنے کے ساتھ ہی وہ دھڑام سے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید ہونقوں کی طرح سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ سو میل کے فاصلے میں سے ابھی صرف پچاس میل طے ہوئے تھے۔ یعنی ابھی وہ گھر سے پچاس میل دور تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں۔ موٹر سائیکل بھی شہر کی طرف ہی لے جائی گئی تھی۔ وہ پیدل چلتے ہوئے بھی گھر جا سکتے تھے، لیکن اس طرح بہت دیر ہو جاتی۔ جب کہ وہ فوراً وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کا جی چاہا۔۔۔ کاش کوئی کار ہی اس طرف آ جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حافظ آباد کی طرف سے ایک گاڑی کی روشنیاں دکھائی دیں۔ ان کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔ پھر اچانک انہیں بیگم جمشید کا خیال آیا ___ بھلا وہ بیگم کو جنگل میں دشمنوں کے قبضے میں چھوڑ کر کس طرح جا سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دشمن انہیں موٹر سائیکل پر تو بٹھا کر لے نہیں گیا ہو گا جس کا مطلب یہ تھا کہ دشمن ایک سے زیادہ تھے ان میں سے ایک نے بیگم جمشید کو سڑک سے ہٹایا اور جب وہ جنگل میں انہیں تلاش کرتے ہوئے دور نکل گئے تو دوسرا موٹر سائیکل لے بھاگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم ابھی یہیں کہیں تھیں اور دشمن اس وقت بھی شاید ایک سے زیادہ تھے۔ انہوں نے دل ہی دل

میں فیصلہ کیا۔۔۔۔ میں اس جنگل کو چھانے بغیر گھر نہیں جاؤں گا ___ دیکھا جائے گا۔ پھر قریب آتی ہوئی کار کو دیکھ کر انہیں ایک اور تدبیر سوجھی۔ انہوں نے کار والے کو کار روکنے کے لیے اشارہ دیا ___ کار ان کے قریب آ کر رک گئی۔ ڈرائیور کی جگہ ایک نوجوان آدمی بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کار میں اور کوئی نہیں تھا۔

"کیا آپ میری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں ___ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"مجھے جانا تو کہیں نہیں ___ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ شہر جا کر ایک فون کر دیں۔ میں فون نمبر اور پیغام لکھے دیتا ہوں۔"

"بہت اچھا ___ مگر آپ یہاں جنگل میں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے ___ چند روز بعد اخبار میں پڑھ لیجئے گا۔"

"بہت خوب ___ تو آپ کسی اخبار کے ایڈیٹر ہیں؟" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ بات نہیں۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے جیب سے کاغذ اور قلم نکال لیا۔ کار والا بھی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

انسپکٹر جمشید کاغذ پر نمبر اور پیغام لکھنے لگے۔ دراصل انہوں نے یہ سوچا تھا کہ اکرام کو اطلاع کر دی جائے۔ وہ خود ہی جا کر معاملات سنبھال لے گا۔

اور وہ یہاں بیگم کی تلاش کا کام جاری رکھیں گے۔ ویسے ابھی تک ان کی سمجھ میں
یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ سب چکر کیا ہے ۔ کون اس چکر کو چلا رہا ہے اور
کیوں ۔۔۔ صرف ایک بات اس وقت تک ثابت ہوئی تھی ۔۔۔۔ اور
وہ یہ کہ وہ جو کوئی بھی تھا ۔۔۔ بہت چالاک تھا۔ بہت ہی زیادہ۔
انہوں نے کاغذ کا پرزہ نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔ اس وقت انہوں نے
اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا لگا۔
"میں نے شاید آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" انہوں نے سوچ میں ڈوبتے
ہوئے کہا۔
"ہو سکتا ہے۔"
"آپ کا نام کیا ہے۔"
"مجھے ابرار بیگ کہتے ہیں ۔۔۔ کیسے ۔۔۔ کچھ یاد آیا آپ کو۔" اس
نے مسکرا کر پوچھا۔
"نہیں ۔۔۔ لیکن میرا ذہن بار بار مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ آپ کو اس
سے پہلے کہیں دیکھا ضرور ہے ۔۔۔ خیر دیر نہ کیجئے۔ یہ پیغام بہت ضروری ہے۔"
"ارے مجھے یاد آگیا ۔۔۔ آپ انسپکٹر جمشید تو نہیں۔"
"آپ نے ٹھیک سمجھا ۔۔۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک یاد
نہیں کر سکا۔" انہوں نے کہا۔
"کوئی بات نہیں ۔۔۔ میں آپ کو یاد دلاتا ہوں۔"
یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا ۔۔۔ اس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس

میں ایک نیلے رنگ کا رومال تھا۔ اس نے رومال کی تہہ کھول کر ان کے چہرے
کے سامنے کر دی۔
"اس رومال پر لکھے ہوئے الفاظ دیکھ کر آپ کو سب کچھ یاد آجائیگا۔"
انسپکٹر جمشید نے رومال کو گھور کر دیکھا ۔۔۔۔ اس پر سرے سے کوئی
الفاظ نہیں تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتے ۔۔۔۔ ان کا سر زور سے
چکرایا اور وہ دھڑام سے سڑک پر گر پڑے۔
نوجوان انہیں گرتے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر اس نے زور سے تالی بجائی۔
فوراً ہی جنگل میں ایک طرف جھاڑیوں میں حرکت ہوئی اور تین سائے کار کی
طرف بڑھنے لگے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔
"کیا کام ہو گیا۔"
"ہاں ۔۔۔ انسپکٹر جمشید بیچارے بے ہوش ہو چکے ہیں۔"
"بہت خوب ۔۔۔ ہمارا پورا منصوبہ بالکل ہماری مرضی کے مطابق
مکمل ہو گیا ۔۔۔ اب صرف ایک کام رہتا ہے، ان سب کو وہاں پہنچانا۔"
"ہاں ۔۔۔ وہاں ۔۔۔ جہاں سے آج تک کوئی دوبارہ اس دنیا میں
نہیں آیا۔" نوجوان نے مسکرا کر کہا اور وہ انسپکٹر جمشید پر جھک گیا۔

تین قیدی

محمود کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ وہ ایک پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ پلنگ کے پاس ایک میز اور ایک کرسی بھی موجود تھی۔ میز پر ٹیلی فون رکھا تھا۔

وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے سب کچھ ایک دم یاد آ گیا تھا۔ اس نے حملہ آور پر پیچھے سے حملہ کر دیا تھا، لیکن حملہ آور نے چکر کھاتے ہوئے اسے دیوار کے ساتھ دے مارا تھا۔ پھر اس نے خود ہی محمود کو اٹھایا تھا، لیکن چند قدم چلنے کے بعد ہی وہ دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ پہلا سوال جو اس کے ذہن میں آیا، وہ یہ تھا کہ آخر میں بے ہوش کیوں ہو گیا تھا۔ چوٹ اتنی نہیں آئی تھی کہ بے ہوش ہو جاتا۔ اچانک اسے یاد آیا، بے ہوش ہونے سے پہلے اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

یہ سب باتیں یاد آتے ہی اس نے کمرے کو گھور کر دیکھا۔ یہ کمرہ ان کا تو نہیں تھا — تو . . . . پھر . . . . وہ کہاں تھا — اس کا سر گھوم گیا — پھر خود پر قابو پا کر دروازے کی طرف بھاگا — ایک جھٹکے سے دروازے کو کھولنا چاہا، لیکن دروازہ تو باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ وہ مڑا اور فون کے قریب

پہنچا — اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے چاہے، لیکن معلوم ہوا کہ نمبر ڈائل کرنے والا چکر توڑ دیا گیا تھا۔ وہ اس فون سے کسی کے نمبر ڈائل نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے زور زور سے کریڈل پر ہاتھ مارا — دوسری طرف سے فوراً جواب ملا:

"کیا بات ہے — کیوں پریشان ہو رہے ہو؟"

"میں کہاں ہوں؟"

"میرے گھر میں —" جواب ملا۔

"آپ . . . . آپ وہی تو نہیں جو مجھے اپنے گھر میں نظر آئے تھے؟"

"ہاں! میں وہی ہوں۔"

"مجھے یہاں کیوں بند کیا گیا ہے؟" محمود نے بوکھلا کر پوچھا۔

"بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

"ابھی بتا دینے میں کیا حرج ہے؟" محمود نے بے چین آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ کمرے میں گھومو، پھرو، آرام کرو — کچھ کھانے پینے کو جی چاہے تو فون پر کہہ دو — یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

"لیکن آخر مجھے یہاں رکھا کس لیے گیا ہے؟"

"میں نے کہا نا، بہت جلد پتا چل جائے گا۔"

"آپ غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ اس طرح کسی کو قید رکھنا جرم ہے۔ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، قانون آپ تک پہنچ جائے گا۔"

"ایسی باتیں نہ سوچو — میرے ہاتھ قانون سے بھی لمبے ہیں — اگر

میں خود تمہیں اپنی شکل نہ دکھاتا تو قیامت تک تمہیں بھی معلوم نہ ہوتا۔"

"تو پھر تم نے مجھے اپنی صورت کیوں دکھائی؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا

"بس یونہی...... اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اب تم کبھی واپس نہیں جا سکو گے۔"

"کیا مطلب؟" محمود بڑے زور سے اچھلا۔

"ہاں! مجھے افسوس ہے کہ اب تم کبھی اپنے گھر واپس نہیں جا سکو گے، تاہم میں آخری وقت سے پہلے تمہیں تمہارے والد اور بھائی بہن کی شکل ضرور دکھا دوں گا۔ لیکن تم ان سے کوئی بات نہیں کر سکو گے۔"

"آخری وقت ـــ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"آخری وقت سے مراد آخری وقت ہی ہوتی ہے۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

"خیر دیکھا جائے گا، تمہارا آخری وقت آتا ہے یا میرا ـــ ویسے تم مجھے ان کی شکل کس طرح دکھاؤ گے؟"

"وہ بھی میرے مہمان ہیں۔"

"کیا!!!" محمود پوری قوت سے چلایا۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان میں بے پناہ خوف سمٹ آیا۔

فاروق اور فرزانہ میں سے پہلے فرزانہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبرا کر پلکیں جھپکیں ـــ اس کے ساتھ ہی فرش پر فاروق بے سدھ پڑا تھا۔ اس نے

اسے جھنجھوڑ ڈالا:

"اٹھو فاروق ـــ اٹھو۔"

"سونے دو ـــ کیا کرتی ہو ـــ میں اس وقت ایک بہت خوبصورت خواب دیکھ رہا ہوں ـــ میرا گھوڑا اس وقت بادلوں کے پار اڑ رہا ہے۔"

فاروق نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم فوراً جاگ نہ گئے تو سچ مچ بادلوں کے پار پہنچ جاؤ گے۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"تو کیا ہوا ـــ یہ تو اور بھی اچھا ہو گا ـــ میں بادلوں کے پار والے ب میں چہل قدمی کیا کروں گا۔" فاروق نے بدستور آنکھیں بند کیے جواب دیا۔

"میں کہتی ہوں، اٹھو۔"

"میں کہتا ہوں، سونے دو۔" فاروق نے جھنجھلا کر کہا۔

"اگر نہ اٹھے تو پانی کی بالٹی الٹ دوں گی۔" فرزانہ نے دھمکی دی حالانکہ کمرے میں بالٹی اور پانی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔

"ارے باپ رے۔ ٹھہرو ـــ ابھی اٹھتا ہوں ـــ پانی نہ انڈیلنا۔ ابھی میرا نہانے کا پروگرام نہیں ہے۔" فاروق نے کہا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر آنکھیں مل مل کر کمرے کو دیکھنے لگا۔

"ہیں ـــ یہ ہم کہاں ہیں؟"

"فرش پر ـــ" فرزانہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں ـــ لیکن یہ فرش کہاں ہے؟"

"اس کمرے میں ہے۔" فرزانہ بولی۔

"بہت خوب — یہ ہوا نہ جواب — مطلب یہ ہوا کہ یہ ہمارا کمرہ نہیں ہے۔ ورنہ میں چارپائی پر ہوتا۔"

"بہت جلدی سمجھ گئے۔" فرزانہ نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"مرچیں کیوں چبا رہی ہو، کیا کھانے کو کچھ نہیں ملا؟"

"بے وقوف — ہم کسی کی قید میں ہیں — یاد کرو — ہم نائیلون کی رسی کے ذریعے اپنے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے کمرے میں محمود بے ہوش پڑا تھا۔ ہم اس پر جھکے ہی تھے کہ ایک آواز سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"یاد آ گیا — لیکن ہم بے ہوش کیوں ہوئے تھے؟"

"مجھے کیا پتا —" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"سوال یہ ہے کہ محمود کہاں ہے؟" فاروق نے کہا۔

"خدا جانے ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں۔"

"ارے — یہاں تو فون بھی رکھا ہے — آؤ ابا جان کو فون کریں۔"

فاروق کی نظر جونہی میز پر رکھے فون پر پڑی، وہ خوش ہو گیا۔

"کیا ہمیں یہاں تک لے آنے والا اس قدر بے وقوف ہے کہ فون کرنے کے قابل رہنے دیا ہوگا۔" فرزانہ نے مایوس ہو کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو — لیکن، اس فون پر شاید ہم اس سے بات کر سکیں۔"

"تو ٹھیک ہے — کر لو — میں تو اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔"

"تمہارا کیا ہے — تم تو کسی بھی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔"

فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور فون کی طرف بڑھا — اس نے دیکھا، ڈائیل ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور کریڈل کو بار بار دبانے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے تم جاگ گئے ہو۔"

"معلوم ہونے والی کون سی بات ہے — تم جو کوئی بھی ہو، ہمارے لیے ناشتے کا بندوبست کرو کیونکہ ہم نے رات سے کچھ نہیں کھایا — پارٹی میں سے بھی ہم خالی پیٹ ہی بھاگ آئے تھے۔"

"عجیب بات ہے، تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کہاں ہو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"جب بھوک زوروں کی لگی ہوئی ہو تو سب سے پہلے کھانے پینے کا خیال آتا ہے۔ جب پیٹ بھر جائے گا تو پھر پوچھیں گے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں ناشتا ضرور ملے گا، لیکن ابھی ناشتے کا وقت نہیں ہوا — یہاں ہر کام وقت پر ہوتا ہے۔"

"تو پھر اس وقت کس کام کا وقت ہے۔ ہمیں بتا دو — ہم وہی کام شروع کر دیتے ہیں۔"

"تم تو مہمان ہو — وہ بھی چند دنوں کے — اس لیے تم سے کیا کام لینا — مہمانوں سے کام لینا کوئی اچھی بات تو نہیں —" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اور دوسروں کو کمروں میں بند رکھنا اچھی بات ہے۔" فاروق نے کہا۔

"نہیں تو ـــــ تم دونوں کمرے میں بند تو نہیں ہو ـــــ تم چاہو تو کمرے سے نکل کر برآمدے میں بھی آسکتے ہو۔ لیکن برآمدے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا، ہر طرف بجلی کا کرنٹ دوڑ رہا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ تو پھر ناشتے سے پہلے ہم چہل قدمی کریں۔"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ـــــ ضرور ـــــ"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم چاہتے کیا ہو۔"

"بہت جلد تمہیں بتا دیا جائے گا۔"

"کیا ہمارے ابا جان کو ہمارے بارے میں معلوم ہے۔" فاروق نے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"کیا معلوم ہو جائے گا۔" فاروق نے ایک دم پوچھا۔

"یہی کہ تم لوگ غائب ہو۔"

"اور محمود کہاں ہے ـــــ"

"وہ بھی یہیں ہے ـــــ تمہارے بالکل قریب ـــــ کمرے سے نکل کر تم اسے دیکھ سکتے ہو۔"

"ارے!" وہ اچھل پڑا ـــــ ریسیور کریڈل میں پٹختے ہوئے اس نے فرزانہ سے کہا۔

"فرزانہ! محمود بھی یہیں ہے ـــــ آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں دروازے کی طرف جھپٹے ـــــ واقعی دروازہ کھلا تھا۔

کار والا

سورج کی تیز کرنیں جب انسپکٹر جمشید کے جسم میں چبھنے لگیں تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے دیکھا، وہ ابھی تک اسی جگہ تھے جہاں رات کو کار والے کے پاس کھڑے تھے۔ کار والے سے باتیں کرتے کرتے وہ دھڑام سے گر گئے تھے اور بے ہوش ہو گئے تھے۔

"آخر میں بے ہوش کس طرح ہو گیا تھا۔" انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔

پھر اچانک انہیں بیگم جمشید کا خیال آگیا۔ وہ دیوانوں کی طرح جنگل میں دوڑنے لگے۔ اب رات کا وقت نہیں تھا کہ انہیں درختوں کو چلنے میں کوئی دقت ہوتی۔ وہ ادھر سے اُدھر دوڑنے لگے۔

پھر اچانک ان کے قدم ایک دم رک گئے۔ ایک جھاڑی میں انہیں بیگم کا دوپٹہ نظر آگیا تھا۔ آسمانی رنگ کا دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اگر جھاڑی میں الجھا ہوا نہ ہوتا تو نہ جانے اس وقت تک کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہوتا۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھے۔ دوپٹہ انہوں نے جھاڑی سے چھڑا کر ہاتھ میں لے لیا اور ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔

زمین پر قدموں کے کچھ نشان نظر آئے۔ وہ ان نشانات کے ذریعے

آگے بڑھنے لگے۔ قدموں کے نشانات دو آدمیوں کے تھے، لیکن یہ دونوں مردانہ جوتوں کے نشان تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم جمشید کو بھی وہ لوگ سڑک پر سے بے ہوش کرنے کے بعد لے گئے تھے، ورنہ ان کے قدموں کے نشانات بھی وہاں ہوتے۔

نشانات انہیں ایک کھڈ میں لے گئے۔ یہ تین فٹ گہری اور تقریباً سات آٹھ فٹ لمبی کھڈ تھی۔ بیگم جمشید اس میں اوندھے منہ پڑی تھیں۔ انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، پھر ایک لمبی چھلانگ انہیں بیگم جمشید کے قریب لے گئی۔ انہوں نے جلدی سے بیگم کو سیدھا کیا اور یہ دیکھ کر اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا کہ بیگم صرف بے ہوش تھیں۔ ان کے جسم پر کوئی زخم بھی نہیں تھا۔ انہوں نے انہیں ہوش میں لانے کے لیے جھنجھوڑا، آوازیں دیں، تب کہیں جا کر ان کی آنکھیں کھلیں۔

"ارے! میں کہاں ہوں؟"

"ہم اس وقت اسی جنگل میں ہیں بیگم — جس میں رستا بندھا ہوا دیکھ کر رک گئے تھے۔"

"اوہ! مجھے کیا ہوا تھا؟"

"دشمنوں نے شاید تمہیں بے ہوش کر دیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد آگیا — آپ رسا کھولنے کے لیے درخت کی طرف گئے ہی تھے کہ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آوازیں سنیں، میں گھبرا کر پلٹی، اسی وقت کسی نے میری ناک پر رومال رکھ دیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔"

"اوہ — اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی کوئی مدد نہ کر سکے۔"

"اللہ محافظ ہے — کیا تم اٹھ کر چل سکتی ہو — کم از کم سڑک کے کنارے تک — ہم وہاں کسی کار وغیرہ کا انتظار کریں گے۔"

"ہاں میں چل سکتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انسپکٹر جمشید انہیں سہارا دیتے ہوئے سڑک کے کنارے تک آئے اور زمین میں گڑے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

یہ سڑک آمد و رفت کے لیے بہت کم استعمال ہوتی تھی۔ حافظ آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور گاؤں سے شہر آنے جانے والوں کی تعداد بہت کم تھی، اس لیے سڑک زیادہ تر سنسان پڑی رہتی۔ ایک دوسری سڑک بھی تھی، لیکن وہ بہت لمبی تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بچوں کو کوئی خطرہ پیش ہی نہ آیا ہو۔" بیگم جمشید نے کچھ دیر بعد کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے — اگر انہوں نے مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہوتی تو میں سوچ لیتا کہ بچوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن حالات یہ ہیں کہ ہمیں پہلے افتخار چچا کی وفات کی خبر بذریعہ تار ملی ہے۔ دوسری طرف فاروق اور فرزانہ کا اپنے دوست طاہر کے گھر جانے کا پہلے ہی پروگرام بن چکا ہے۔ گھر میں صرف محمود ہے۔ ایسے میں اس کے سوا کیا سوچا جا سکتا ہے کہ خطرہ محمود کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ہمارے راستے میں رستا باندھنے کا

مطلب بھی یہی نظر آتا ہے کہ ہم رات سے پہلے واپس گھر نہ پہنچ سکیں۔ تاکہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں۔"

"اوہ! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں یہاں اسی لیے الجھایا گیا تھا۔"

"بالکل ۔۔۔ اب خدا جانے وہاں کیا حالات ہوں۔"

"دیکھیے ۔۔۔ ایک کار حافظ آباد کی طرف سے آ رہی ہے۔" اچانک بیگم جمشید نے کہا۔

"بشرطیکہ یہ بھی مجرموں کی کار نہ ہو۔"

"دیکھا جائے گا ۔۔۔"

"اچھا میں اسے روکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سڑک پر آئے اور ہاتھ کے اشارے سے کار والے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر جونہی کار نزدیک آئی، وہ بڑے زور سے اچھلے۔

فاروق اور فرزانہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ ساتھ ہی انہیں ایک اور کمرہ بھی نظر آیا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں دو کھڑکیاں تھیں جن میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے ایک کھڑکی کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ کمرے کے اندر محمود ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

"محمود!" فاروق چلا اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ محمود اسی طرح بیٹھا رہا تھا جیسے فاروق کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچی ہو۔

انہوں نے بے ابی کے عالم میں کھڑکی کے شیشے پر زور زور سے ہاتھ مارے لیکن اس پر بھی محمود کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

"یہ کیا بات ہے فاروق ۔۔۔ کیا محمود بہرہ ہو گیا ہے؟" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"خدا جانے کیا بات ہے ۔۔۔ ٹھہرو ۔۔۔ میں ایک تجربہ کرتا ہوں۔ تم ذرا واپس اپنے والے کمرے میں جاؤ۔ میں باہر سے تمہیں آواز دوں گا۔"

"اچھا۔" فرزانہ نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

فاروق نے دروازہ بند کر دیا۔ اور کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شیشے سے فرزانہ صاف نظر آئی۔ اس نے فرزانہ کو آواز دی، لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ مسکرا اٹھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور فرزانہ سے کہا:

"باہر آ جاؤ فرزانہ ۔۔۔"

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"میں اندر سے تمہیں نظر آ رہا تھا یا نہیں؟"

"نہیں ۔۔۔ نہ جانے یہ کیسے شیشے ہیں۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"میں حیران ہوں ۔۔۔ ان شیشوں کے ذریعے اندر کی چیز باہر سے نظر آ سکتی ہے، لیکن اندر سے کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔۔۔ اور یہ کمرے ساؤنڈ پروف بھی ہیں۔"

"اور اسی لیے محمود ہمیں نہیں دیکھ سکا اور نہ ہماری آواز سن سکا!"

"تو پھر آؤ! دروازہ کھول کر اندر جانے کی کوشش کریں۔"

"ہاں آؤ۔"

انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہ ہوا، جس کا مطلب یہ تھا کہ دروازے میں تالا لگا یا جا چکا ہے۔ تالے کے لیے کوئی سوراخ بھی نہیں بنا ہوا تھا، البتہ ایک طرف کچھ بٹن لگے ہوئے تھے۔ اور ان بٹنوں پر ایک سے نو تک نمبر لکھے ہوئے تھے۔

"دروازہ شاید ان میں سے کچھ بٹنوں کو دبا کر کھلتا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں! ہمارے کمرے کے دروازے پر بھی ایسے ہی نمبر لگے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نہ محمود سے مل سکتے ہیں، نہ اس سے باتیں کر سکتے ہیں، بس اسے دیکھ سکتے ہیں۔"

"ہاں! لیکن آخر اس سارے جھنجھٹ کا مطلب کیا ہے۔"

"مطلب ہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"آؤ پورا برآمدہ دیکھیں۔"

دونوں برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گئے۔ دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ تمام کمرے ایک جیسے تھے۔ صرف ان کے کمروں کے علاوہ انہیں کسی اور کمرے میں کوئی انسان نظر نہیں آیا۔

"کم از کم ایک بات ہمارے اطمینان کے لیے کافی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اور وہ کیا۔"

"وہ یہ کہ ابا جان آزاد ہیں، اور وہ ضرور سراغ لگاتے ہوئے ہم تک پہنچ جائیں گے۔"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا ــــ حالات عجیب و غریب ہیں۔ نہ جانے ہم شہر کے کس حصے میں ہیں، اپنے ہی حصے میں ہیں یا کسی دوسرے شہر میں۔" فاروق کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"فاروق ــــ مایوسی گناہ ہے ــــ حوصلہ نہ ہارو۔"

"بے فکر رہو ــــ میں کسی حالت میں حوصلہ نہیں ہارتا۔"

"مجھے بہت بھوک لگی ہے ــــ اب کیا کریں۔"

"آؤ اپنے کمرے میں چل کر اس سے کھانے کے لیے کہیں۔" فاروق نے کہا۔

دونوں اپنے کمرے میں داخل ہوئے اور چونک اٹھے۔ کمرے میں میز پر کھانے کی ٹرے رکھی تھی۔ دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر برآمدے میں جانے کے لیے دروازے کی طرف آئے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن دروازہ شاید باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔

"اب شاید وہ محمود کو برآمدے میں گھومنے کی اجازت دے گا۔ اور محمود ہمیں باہر کھڑا ہو کر دیکھے گا، ہمیں آوازیں دے گا، لیکن ہم اس کی آواز نہ سن سکیں گے، نہ شکل دیکھ سکیں گے۔"

"اوہ! آخر وہ کیا چاہتا ہے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہمیں بے بسی کے احساس میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے، ہم اس کے سامنے بالکل بے حقیقت ہو جائیں۔ وہ ہم سے بلی چوہے والا کھیل کھیل رہا ہے۔"

"اوہ! ــــ تو ہم اس کی نظر میں چوہے ہیں۔"

"ہاں!" فاروق نے عجیب سے انداز میں کہا اور پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

اس کا قہقہہ لمبا ہوتا چلا گیا — اتنا لمبا کر فرزانہ گھبرا گئی۔ اس نے سوچا — کیا فاروق پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے گلا پھاڑ کر کہا:

"فاروق! تمہیں کیا ہو گیا ہے!"

خوفناک منصوبہ

کار میں بیٹھے ہوئے شخص کی نظر جونہی سڑک پر کھڑے انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید پر پڑی، اس کی آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"انسپکٹر جمشید — یہ آپ ہیں!" اس کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں، پروفیسر صاحب... مگر آپ یہاں کہاں!"

انسپکٹر جمشید کا بھی حیرت کے مارے برا حال تھا۔ پروفیسر ریاض ملک کا مشہور سائنس دان تھا۔ پروفیسر داؤد کے دوستوں میں سے تھا۔ اور کئی تقریبات میں انسپکٹر جمشید اور ان کے بچوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ملک کے لیے اس نے کئی مفید ایجادات بھی کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اس جنگل میں سے گزرتے دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"میں حافظ آباد سے آگے اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے بیمار ہے۔ واپسی پر میں نے اس سڑک کے ذریعے آنے کا پروگرام بنا لیا... کیونکہ مجھے ہرے بھرے درختوں سے بہت لگاؤ ہے۔ میں لہلہاتے کھیت دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں، مگر یہ تو بتائیں، آپ دونوں یہاں کیسے پہنچ گئے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

یہ ایک لمبی کہانی ہے ——— ہمیں شہر جانا ہے ——— اگر آپ لفٹ دینا پسند کریں۔"

"ارے ارے ——— یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ پروفیسر داؤد کے دوست ہیں، میں بھی پروفیسر کا دوست ہوں۔ اس طرح آپ بھی میرے دوست ہوئے۔ اگر دوستی کا یہ رشتہ نہ بھی ہوتا تو عام راہگیروں کی حیثیت میں بھی میں آپ دونوں کو لفٹ ضرور دیتا، کیونکہ یہ اخلاقی فرض ہے ——— ویسے میں اب تک حیران ہوں کہ آپ یہاں کس طرح موجود ہیں۔ نہ کوئی سواری... اور نہ کوئی سامان!"

"میں نے عرض کیا نا... یہ ایک لمبی کہانی ہے ——— راستے میں بتاؤں گا ——— آئیے پھر ———"

پروفیسر ریاض نے کہا اور انسپکٹر جمشید ان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بیگم جمشید نے پچھلی سیٹ کا رُخ کیا۔ پروفیسر ایک لمبے چوڑے آدمی تھے۔ ان کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ چہرہ بھی گولائی لیے ہوئے تھا۔ ناک ذرا چھوٹی تھی۔

سفر کے دوران انسپکٹر جمشید نے انہیں تفصیل سے ساری کہانی سنائی۔ پروفیسر ریاض یہ کہانی سُن کر دنگ رہ گئے۔ انہوں نے کہا:

"آپ کا مطلب یہ ہوا کہ اس مرتبہ مجرم نے آپ کو خوب نچایا ہے۔"

"جی ہاں! وہ بہت چالاک ہے ——— ذہن سے کام لینے کا ماہر ہے ——— وہ ہاتھوں یا ہتھیاروں سے لڑنے کی بجائے دماغ سے لڑتا ہے۔ اس کی چالیں

اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب وہ کام دکھا جاتا ہے۔ میں نے آج تک اتنے تیز اور طرار ذہن کا مجرم نہیں دیکھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ ابھی تک سات پردوں میں چھپا بیٹھا ہے، میرے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔"

"پھر اب آپ کیا کریں گے؟" پروفیسر ریاض نے پوچھا۔

"اب سب سے پہلے گھر جا کر حالات کا جائزہ لوں گا۔ اس کے بعد کوئی پروگرام ترتیب دوں گا۔" انہوں نے کہا۔

"آپ نے اپنے اور بیگم صاحبہ کے بے ہوش ہونے کا جو واقعہ بتایا ہے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص سائنسی معلومات بھی رکھتا ہے۔" پروفیسر ریاض نے کہا۔

"جی ہاں! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ——— بیگم کی ناک پر تو مجرم کے آدمی نے رومال بھی رکھا تھا، لیکن آخر میں کیسے بے ہوش ہو گیا تھا، یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آج کل ایسی چیزیں ایجاد ہو چکی ہیں جو اگر انسان کے قریب کر دی جائیں تو ان میں سے ایسی شعاعیں خارج ہوتی ہیں کہ وہ بہت جلد اور غیر محسوس طور پر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہ شعاعیں ان چیزوں سے ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہیں، لیکن اگر ان پر کپڑا ڈھانپ دیا جائے تو شعاعیں خارج نہیں ہوتیں۔ وہ جب کسی کو بے ہوش کرنا چاہتے ہوں گے، بے ہوش کرنے والی اس چیز سے کپڑا ہٹا دیتے ہوں گے ——— اس طرح دوسرا آدمی فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

"لیکن خود وہ بے ہوش کیوں نہیں ہوتا ——— کیا شعاعیں اس پر

اثر نہیں کرتیں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"اس لیے کہ شعاعیں سامنے کی طرف سفر کرتی ہیں، جس طرح ہم ایک آئینے کو دھوپ میں رکھیں تو سامنے شعاعیں پڑتی ہیں اور لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن آئینے کو ہاتھ میں پکڑنے والا اس کی شعاع سے محفوظ رہتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا ـــــ تو وہ کوئی اس قسم کا آلہ استعمال کرتے ہیں۔"

"ہاں! اور یہ آلہ انگوٹھی کے نگینے جتنا ہوتا ہے ـــــ شاید انگوٹھی میں جڑا ہوتا ہو گا۔"

"اوہ!" انسپکٹر جمشید چونکے ـــــ "مجھے یاد آگیا ـــــ کار والے نوجوان کی انگلی میں ایک انگوٹھی موجود تھی۔"

"تب اس انگوٹھی کا ایک ڈھکنا یا خول بھی اس نے بنوا رکھا ہو گا۔ آلہ ضرورت نہ ہونے کے وقت وہ اسے ڈھانپ رکھے۔"

"ٹھیک ہے ـــــ اب میں بالکل سمجھ گیا۔ ذرا یہ بتائیے آپ کے خیال میں ان شعاعوں سے آدمی کتنی دیر میں بے ہوش ہو جاتا ہے؟"

"بس تقریباً تیس سیکنڈ میں ـــــ بعض حالتوں میں اس سے بھی کم وقت میں۔ . . تھکا ہوا آدمی تو فوراً ہی بے ہوش ہو سکتا ہے ـــــ مثلاً کوئی دور سے دوڑتا ہوا آئے، وہ ہانپ رہا ہو اور اس کے جسم پر شعاع پڑ جائے تو وہ فوراً ہی بے ہوش ہو جائے گا۔"

"ہوں ـــــ ساری بات سمجھ میں آگئی ـــــ تو پھر اس سے محفوظ رہنے

کے لیے بھی کوئی چیز ضرور ایجاد کی گئی ہو گی۔"

"یقیناً . . . . . لیکن اس سلسلے میں پروفیسر داؤد آپ کی مدد کر سکتے ہیں، کیونکہ میری لائن ذرا دوسری ہے اور اس موضوع پر میں نے کبھی تجربات نہیں کیے۔"

"خیر! میں اُن سے کبھی ملوں گا۔"

کار تیز رفتاری سے سفر طے کرتی ہوئی آخر شہر میں داخل ہوئی۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔

"بس اب آپ ہمیں اتار دیں ـــــ یہاں سے ہم ٹیکسی پکڑ لیں گے۔"

"لیکن کیوں . . . . کیا میں آپ کو گھر تک نہیں پہنچا سکتا؟" پروفیسر ریاض نے مسکرا کر کہا۔ "اور پھر میں یہ بھی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے بچے تو خیریت سے ہیں ـــــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال بالکل غلط ہو اور انہیں کوئی حادثہ سرے سے پیش نہ آیا ہو۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو ـــــ" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

ٹھیک دس منٹ بعد کار انسپکٹر جمشید کی گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ بریک لگتے ہی انسپکٹر جمشید تیزی سے نیچے اترے اور گھر کی طرف بھاگے۔ گلی میں گزرتے لوگ انہیں اس طرح بھاگتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

انسپکٹر جمشید نے دروازے کو ایک دھکا دیا ـــــ انسپکٹر جمشید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاگلوں کی طرح اندر گھس گئے۔ پروفیسر ریاض اور بیگم جمشید بھی ان کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

چند منٹ بعد انہیں یہ حقیقت معلوم ہو چکی تھی کہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔

محمُود اپنے خیالوں میں گم تھا کہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ آواز اُس سے کہہ رہی تھی،

"اب تم کمرے سے باہر نکل کر اپنے بہن اور بھائی کو ایک نظر دیکھ لو — کیونکہ اس کے بعد تمہیں میرے پاس آنا ہے۔"

"بہت اچھا!" محمود نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ دروازہ کیسے کھلے گا؟"

"ہینڈل پکڑ کر اپنی طرف کھینچو — دروازہ کھل جائے گا۔"

"یہ تو میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"جب تک میری مرضی نہ ہو، دروازہ نہیں کھلتا۔" آواز آئی۔

آخر محمود دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اس نے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی کے ذریعے اندر جھانک کر دیکھا — وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فاروق پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا مگر اس کے ہنسنے کی آواز اس کے کانوں تک نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سوچا، شاید فاروق آواز پیدا کیے بغیر ہنسنے کی مشق کر رہا ہے . . . . ساتھ ہی اس نے فرزانہ کو دیکھا — وہ بھی خوفزدہ انداز میں فاروق کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا، یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر زور سے دستک دی۔

انہیں آوازیں دیں، مگر ان دونوں کے کانوں پر تو جیسے جوں تک نہ رینگی۔

اب تو محمود بہت پریشان ہوا۔ اسے یہ بھی حیرت تھی کہ یہ دونوں یہاں کس طرح پہنچ گئے۔ یہ تو طاہر کی سالگرہ میں گئے ہوئے تھے۔

اچانک برآمدے میں وہی آواز ابھری۔

"محمود! تمہاری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچے گی — تم ان دونوں کو دیکھ چکے، یہی کافی ہے، اب تم میرے پاس آجاؤ — وقت ضائع نہ کرو۔"

"مگر میں تمہارے پاس کس طرح آجاؤں — مجھے کیا معلوم کہ تم کہاں ہو —" محمود نے جھلا کر کہا۔

"فکر نہ کرو — تم خود بخود میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی محمود کی طرف نہ جانے کس طرف سے سفید دھوئیں کی ایک لکیر تیر کی طرح آئی۔ محمود اس سے بے خبر تھا، اگر خبردار بھی ہوتا تو بھی نہ بچ سکتا، کیونکہ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایک بار پھر اس کا سر زور سے چکرایا اور وہ فرش پر گرتا چلا گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک اور کمرے میں پایا — یہاں وہ موجود تھا، جو اسے اپنے گھر میں نظر آیا تھا اور جو اس سارے چکر کی وجہ تھا — کمرے میں عجیب و غریب سائنسی آلات لگے ہوئے تھے۔ محمود کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا!"

"بہت بہت شکریہ ۔" محمود نے اس طرح خوش ہو کر کہا جیسے اسے آزادی کی خوشخبری سنائی گئی ہو۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں کون ہوں اور کیا کام کرتا ہوں ۔۔۔ اگر نہیں جانتے تو بتائے دیتا ہوں کہ ایک سائنسدان ہوں ۔۔۔ لیکن سب لوگوں کا خیال یہ ہے کہ میں ملک کے لیے مفید کام کرتا رہتا ہوں ۔ جب کہ اصل بات یہ ہے کہ میں اس ملک کا دشمن ہوں ۔۔۔ آج تک جو چیزیں میں بھی بنائیں اس مقصد کے لیے بنائیں کہ اس ملک کو نقصان پہنچے ، لیکن ظاہر میں ایسا نظر نہیں آتا ۔۔۔ اگر نظر آتا تو میں کب کا گرفتار ہو چکا ہوتا۔ اب یہ راز صرف تمہیں معلوم ہے ۔۔۔ مثلاً میں تمہیں بتاتا ہوں پچھلے دنوں میں فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے ایک سفوف ایجاد کیا تھا ۔ اسے فصلوں پر آزمایا گیا تو میری خدمات کی تعریفوں کے پل باندھ دیے گئے ۔ اخبارات میں میری تصاویر شائع ہوئیں ۔ اب کسی کو کیا بتا کہ اس سفوف کی مدد سے بڑھنے والی پیداوار جب کھائی جائے گی تو پیٹ کی ان گنت بیماریاں پیدا ہوں گی اور اس طرح پوری کی پوری قوم بیماریوں کا شکار ہو جائے گی ۔"

"کیا ۔ ۔ ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔" محمود نے خوفزدہ لہجے میں کہا ۔

"ابھی تو تم نے ایک مثال ایسی سنی ہے ۔۔۔ میں نے تو نہ جانے کون کون سی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جو ظاہر میں بہت مفید نظر آتی ہیں ، لیکن اندرونی طور پر وہ لوگوں کی جڑیں کاٹ رہی ہیں ۔"

"اوہ !" محمود بھونچکا رہ گیا ۔ مارے خوف کے اس کا سانس ، سینے میں اٹکنے لگا ۔

"اب تم یہ پوچھو کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے ۔" اس نے خوفناک انداز میں مسکرا کر کہا ۔

"کیا کروں گا پوچھ کر ۔۔۔ میں تو اس قوم کے بارے میں سوچ رہا ہوں ، جو تم جیسے شیطان صفت کے شکنجے میں ہے ۔ مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ آخر اس قوم سے تمہیں دشمنی کیا ہے ۔۔۔ کیا تم خود اس قوم کے ایک فرد نہیں ہو ۔"

"یہی تو بات ہے ۔۔۔ میرا تمہاری قوم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ میں تو تمہارے دشمن ملک کا سب سے بڑا خیر خواہ ہوں ۔۔۔ اس ملک کی حکومت کے احکامات پر عمل کرتا ہوں ۔"

"اوہ ! تو تم غیر ملکی حکومت کے جاسوس ہو ۔" محمود کو دھکا سا لگا تھا یہ سن کر ۔

"ٹھیک ۔۔۔ اب سنو ۔۔۔ مجھے تین ذہین ترین نوعمر دماغوں کی ضرورت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تم یہاں نظر آ رہے ہو ۔۔۔ جب میں نے ذہین ترین بچوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو تم تینوں نظر آئے ۔ تمہاری ذہانت ثابت تھی اور پھر تم تینوں کی وجہ سے ہمیں نقصان بھی بہت پہنچا تھا ۔ اس لیے میں نے سوچا ، کیوں نہ ایک پنتھ دو کاج کیے جائیں ۔ بس پھر میں نے تمہیں اپنے پاس بلا لیا ۔"

"تم ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو ۔" محمود نے پرسکون آواز میں کہا ۔

"تم یہ سن کر حواس باختہ نہیں ہوئے، میرا تو خیال تھا کہ تم تھر تھر کانپنے لگو گے ___ گڑگڑاؤ گے، معافیاں مانگو گے ___ مگر تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"تم ہمیں جانتے ہو، پھر بھی یہ کہہ رہے ہو ___ ہماری تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوتی ہے ___ زندگی اور موت کی ہماری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے ___ البتہ قوم کی بہتری کو ہم سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں"

"لیکن میں تمہارا چہرہ خوف کے مارے سفید دیکھنا چاہتا ہوں ___ میں چاہتا ہوں، تم لرزتے کانپتے نظر آؤ ___"

"اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو پھر فاروق اور فرزانہ کو یہاں بلالو۔ شاید ان کا انجام مجھے لرزنے اور کانپنے پر مجبور کر دے اور میرا انجام تمہیں۔ مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہمارے دماغوں کا کرو گے کیا"

"تم تینوں کے دماغوں سے یادداشت صاف کر دوں گا۔ پھر تمہارے دماغ بالکل ننھے منے بچوں کی طرح ہو جائیں گے۔ ان دماغوں میں میں جو بات چاہوں بٹھا سکتا ہوں ___ بس میں ملک دشمنی کی باتیں تمہارے دماغوں میں اس طرح ٹھونس دوں گا کہ تم اس قوم کا بیڑہ غرق کرنے پر تل جاؤ گے۔ تم جو اب تک ملک اور قوم کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکے ہو، اب اس کے خلاف کام کرتے نظر آؤ گے اور آخر گرفتار کر لیے جاؤ گے، یہی تمہارا انجام ہوگا ___ انسپکٹر جمشید بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکے گا ___ کہو کیسا پروگرام ہے؟"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ محمود سکتے میں آ گیا۔ اس سے زیادہ خوف ناک پروگرام تو اس کے کانوں نے کبھی بھی نہیں سنا تھا۔

جنگ چھڑ گئی

تین روز گزر گئے۔ شہر کا چپہ چپہ چھان مارا گیا۔ تمام جرائم پیشہ لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا کہیں دور دور تک پتا نہ تھا۔ بیگم جمشید کا برا حال تھا۔ انسپکٹر جمشید بھی بہت پریشان تھے۔ پھر بھی خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے محکمے کے لوگ اور دوست بھی بہت پریشان تھے۔ کچھ تو ان کے اتنے ہمدرد تھے کہ ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی اور وہ شہر میں تینوں بچوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ آئی جی صاحب، ڈی آئی جی صاحب اور اکرام کی حالت عجیب تھی۔ وہ بار بار فون کر کے انسپکٹر جمشید کو اپنی کوششوں کی اطلاع دیتے۔ محکمے کی طرف سے انسپکٹر جمشید کو ان دنوں چھٹی دے دی گئی تھی۔

پروفیسر داؤد اور خان رحمان بچوں سمیت اُن کے گھر آ گئے تھے۔ خان رحمان تو بیگم کو بھی لیتے آئے تھے تاکہ بیگم جمشید کا کچھ دل بہلے، مگر ایسے میں دل کو قرار کہاں ـــــ بے چینی تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کوئی معمولی بچے تو تھے نہیں کہ کسی کی قید میں آرام سے پڑے رہتے، اُن کے واپس نہ آنے کا یہی مطلب تھا

کہ وہ کسی کے بری طرح قابو میں آ گئے ہیں۔

اس وقت وہ شام کی چائے پی رہے تھے۔ اچانک خان رحمان نے کہا:

"جمشید ـــــ تم اس واقعے کا جائزہ شروع سے لو۔ شاید کوئی ایسی بات ذہن میں آ جائے جس سے کوئی سُراغ مل سکے۔"

"بہت غور کر چکا ہوں۔"

"پھر بھی ـــــ ایک بار پھر جائزہ لینے میں کیا حرج ہے ـــــ" پروفیسر بولے۔

"یہ واقعہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب مجھے تار ملا۔ تار میں لکھا تھا کہ میرے چچا افتخار احمد انتقال کر گئے۔ میں نے فوراً وہاں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ دوسری طرف محمود اور فاروق سے معلوم ہوا کہ انہیں اپنے دوست طاہر کی سالگرہ پر جانا ہے اور یہ کہ وہاں کا پروگرام عشاء کے بعد کا ہے۔ میں نے انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا ـــــ افتخار احمد شہر سے بہت دور کے رشتے دار، اس لیے بچوں کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے ـــــ اس لیے میں نے انہیں اجازت دے دی، لیکن شرط یہ لگائی کہ تینوں میرے ایک گھر میں رہے گا، چنانچہ محمود کو گھر میں رہنا پڑا ـــــ میں بیگم کو لے کر حافظ آباد کے لیے روانہ ہوا اور فاروق اور فرزانہ پارٹی میں شرکت کے لیے۔ میں جب حافظ آباد پہنچا تو پتا چلا کہ افتخار احمد تو زندہ ہیں۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ کسی نے دھوکا دیا ہے ـــــ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو خطرہ ضرور ہے ـــــ سب سے زیادہ خطرے میں مجھے محمود نظر

آیا ___ اس لیے میں نے فوراً فاروق کو فون کیا کہ وہ فرزانہ کو لے کر گھر پہنچے ___"

"اور یہی تمہاری غلطی تھی ___" خان رحمان بول اٹھے۔ "تمہیں چاہیے تھا کہ پولیس کو فون کرتے۔"

"ہاں ___ شاید تم ٹھیک کہتے ہو ___ ویسے میں نے یہی سوچا تھا کہ فاروق اور فرزانہ پولیس سے بہتر رہیں گے۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مجرم کس قدر چالاک ہے اور اس نے کتنا لمبا چوڑا منصوبہ بنایا ہے ___ اس نے تو چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب میں افتخار احمد کو زندہ دیکھوں گا تو فاروق اور فرزانہ کو فون کروں گا ___ دونوں فون سنتے ہی گھر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ ادھر میں دراز ہو جاؤں گا ___ اس لیے وہ پہلے تیار تھا ___ ایک طرف اس نے جنگل میں میرا راستہ روکا، دوسری طرف فاروق اور فرزانہ کو اس قابل نہ رہنے دیا کہ وہ محمود کی کوئی مدد کر سکتے۔ یہاں تک کہ خود فاروق اور فرزانہ بھی اس کے ساتھ غائب کر دیے گئے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ تم بے ہوش کس طرح ہو گئے تھے۔" خان رحمان بولے۔

"اس کے متعلق تو میں بتا سکتا ہوں۔ یہ ایک آلے کی مدد سے بے ہوش کیے گئے تھے ___ اس آلے سے شعاعیں خارج ہوتی ہیں۔"

"جی ہاں ___ پروفیسر ریاض کا بھی یہی خیال ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"پروفیسر ریاض ___ وہ تمہیں کہاں مل گیا۔" پروفیسر داؤد نے چونک کر کہا۔

"اسی سڑک پر ..... وہ حافظ آباد سے آگے کہیں گیا تھا۔ واپسی پر وہ صبح کے وقت اس جگہ سے گزرا تھا جہاں ہم کھڑے تھے۔ اس نے ہمیں لفٹ دی تھی۔"

"ہوں ___ کیا ابھی تک تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی نہیں ___" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"ذرا ذہن پر زور دو ___ آخر مجرم کو یہ کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ دو بچے کسی سالگرہ پارٹی میں بھی جائیں گے۔ تار تو اس نے خود دیا ہو گا۔ تمہارے بارے میں اسے معلوم تھا کہ تم حافظ آباد چلے جاؤ گے۔"

"ٹھہریے ___ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔" خان رحمان چونک کر بولے۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"آخر مجرم کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ حافظ آباد میں ان کا ایک رشتے دار بھی رہتا ہے۔" خان رحمان نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"اوہ!" کئی آوازیں ابھریں۔ وہ حیران رہ گئے۔ یہ ایک بہت اہم سوال تھا۔

"واقعی اس پہلو کی طرف تو میرا دھیان گیا ہی نہیں۔" انسپکٹر جمشید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"اس طرح تو افتخار احمد شک کی زد میں آجاتے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"وہ تو کل تک یہیں تھے۔ آج صبح ہی گئے ہیں . . . بچوں کے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجرم نہیں ہو سکتے۔"

"سوال یہ ہے کہ اس کیس میں مجرم کون کون ہو سکتا ہے۔" خان رحمان بولے۔ "پہلے اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اس کیس میں سب سے پہلے پروفیسر ریاض شک کی زد میں آتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کی بجائے پروفیسر داؤد بولے۔

"وہ کیسے؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"وہ اس طرح کہ آخر عین اس وقت وہ اس سڑک پر کیوں کر آپہنچے . . . جہاں تم دونوں کھڑے تھے۔"

"اس کا جواب تو انہوں نے دیا تھا۔ حافظ آباد سے بھی آگے اپنے کسی عزیز سے ملنے گئے تھے۔"

"اچھا تم بتاؤ — تمہاری نظر میں کون کون شک کی زد میں آتا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"جہاں تک میرا خیال ہے . . . اس کیس میں تین آدمیوں پر شک کیا جا سکتا ہے۔ نمبر ایک افتخار احمد، نمبر دو پروفیسر ریاض، نمبر تین طاہر کے والد خاور احمد۔"

"خاور احمد . . . بھلا اسے کیوں لپیٹ میں لے رہے ہو۔" پروفیسر نے حیران ہو

کر پوچھا۔

"اسے بھی یہ معلوم تھا کہ بچے پارٹی میں شرکت کر رہے ہیں۔"

"لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم حافظ آباد جا رہے ہو۔"

"یہی بات تو الجھن میں ڈال رہی ہے۔ خیر . . . افتخار احمد میرے دور کے چچا ہیں، تینوں بچوں کو اغوا کر کے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ پھر بھی ان پر شک کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ میرے دُور کے چچا لگتے ہیں — پھر بھلا کوئی شخص کس طرح جعلی تار دے سکتا ہے — رہے پروفیسر ریاض — ان پر مجھے شک اس طرح ہوتا ہے — کسی عجیب و غریب آلے سے مجھے بے ہوش کرنا ظاہر کرتا ہے کہ ہمارا واسطہ اس مرتبہ کسی سائنس دان سے آپڑا ہے اور وہی ایک ایسے سائنس دان نظر آتے ہیں جو اس واقعے کے دوران مجھ سے ملے۔ بعض لوگ خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے معصوم بن کر سامنے آجاتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک! میرا بھی یہی خیال ہے۔" خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

پھر وہ سب اپنے اپنے خیالات میں کھو گئے۔ اچانک انسپکٹر جمشید اچھل پڑے۔ ان کے چہرے پر بلا کی حیرت نظر آئی۔ انہوں نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا:

"اوہ! میں سمجھ گیا — اب وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا — مجھے پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی تلاشی لینی ہی ہوگی۔"

محمود کئی لمحوں تک اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اچانک اسے اس کی سخت آواز پھر سنائی دی۔

"تمہاری تجویز بھی مجھے پسند آئی ہے۔ میں فاروق اور فرزانہ کو بھی یہیں بلوا لیتا ہوں ۔۔۔ میں تم تینوں کو خوفزدہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھوں گا، تم کتنے دلیر ہو ۔۔۔ تمہارا حوصلہ کتنا بلند ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بورڈ پر لگے ہوئے بیسیوں بٹنوں میں سے ایک کو دبایا۔ کمرے میں فوراً ہی آواز گونجی۔

"جی ۔۔۔ فرمایئے۔"

"باقی دونوں بچوں کو بھی میرے پاس بھیج دو۔"

"بہت اچھا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

چند منٹ بعد فاروق اور فرزانہ بھی وہیں نظر آئے۔ تینوں خوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور یوں ملے جیسے کئی سال کے بچھڑے ملتے ہیں۔ پھر جونہی ان کی نظر کمرے میں موجود اس آدمی پر پڑی، دونوں بھونچکے رہ گئے۔ پھر اپنی حالت پر قابو پانے میں انہوں نے دیر نہ لگائی۔

"کیا حال ہے محمود۔" فاروق نے چہک کر کہا۔

"شکر ہے خدا کا ۔۔۔ تم سناؤ ۔۔۔ اتنا عرصہ کہاں رہے؟" محمود بولا۔

"بس کیا بتاؤں ۔۔۔ جہاں دشمنوں نے رکھا، ہمیں رہنا پڑا۔"

"بہت خوب ۔۔۔ کہیں ان دنوں شاعری تو نہیں کرتے رہے؟" محمود مسکرایا۔

"نہیں تو ۔۔۔ یہ کس نے کہہ دیا تم سے ۔۔۔ البتہ فرزانہ ضرور اس قسم کی کوشش فرماتی رہی ہے۔"

"بالکل جھوٹ ۔۔۔ بھلا میں کہاں اور شاعری کہاں ۔۔۔ یہ اپنے بس

کا روگ نہیں۔"

"ہاں تمہارے بس کا روگ تو صرف جاسوسی ہے۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"جلنے بھننے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ پہلے یہ سن لو کہ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"چلو بتا دو ۔۔۔"

تینوں کچھ اس طرح کھڑے باتیں کر رہے تھے جیسے اپنے گھر کے کمرے میں باتیں کر رہے ہوں۔ کمرے میں موجود اس خوفناک آدمی کو انہوں نے اس طرح نظر انداز کر دیا تھا جیسے اس کی ان کی نظروں میں کوئی اہمیت ہی نہ ہو ۔۔۔ جیسے وہ اسے کچھ سمجھتے ہی نہ ہوں۔

"تو سنو ۔۔۔ کمرے میں تمہیں جو صاحب نظر آ رہے ہیں، ہمیں اغوا کرنے والے یہی ہیں۔" محمود نے کہا۔

"ارے نہیں ۔۔۔ تم جھوٹ کہتے ہو ۔۔۔ یہ تو بہت نیک آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے، نماز روزے کے پابند بھی ہوں گے کیوں جناب ۔۔۔" فاروق نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں بہت نیک ہوں ۔۔۔ میری نیکی کا اندازہ تمہیں بہت جلد ہو جائے گا۔"

"شکریہ جناب ۔۔۔" فاروق نے پرسکون انداز میں کہا۔

"اغوا کرنے کا مقصد سن کر تمہیں کانپنا اور تھرانا ہو گا۔" محمود نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ صاحب ہمیں تھر تھر کانپتے اور لرزتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"تو کیا انہوں نے ہمیں صرف اسی لیے اغوا کیا ہے۔" فرزانہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ان کی یہ خواہش تو ہم اپنے گھر میں بھی پوری کر سکتے تھے۔ اس کے لیے ہمیں یہاں تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں.... یہ بات نہیں — ہمیں خوفزدہ دیکھنے کے علاوہ بھی یہ کچھ چاہتے ہیں۔" محمود نے بتایا۔

"کیا چاہتے ہیں۔ بات کو گھما پھرا کیوں رہے ہو — سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے۔" فرزانہ جھلا اٹھی۔

"اگر تم سیدھی طرح سننا چاہتے ہو تو یوں ہی سہی — سنو — یہ صاحب ہمارے دماغوں کو بدلنا چاہتے ہیں۔" آخر محمود نے سرد آواز میں کہا۔

"دماغوں کو بدلنا چاہتے ہیں — بھئی واہ مزا آ گیا۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"بھلا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے دماغ بدل جائیں۔ میرے دماغ میں فرزانہ کا دماغ رکھ دیا جائے، میرا دماغ تمہارے دماغ میں اور تمہارا دماغ فرزانہ کے دماغ میں۔" فاروق چہک کر بولا۔

"کیا دماغ دماغ لگا رکھی ہے — کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" محمود نے اسے گھورا۔

"ابھی نہیں چلا — ویسے یہ کوئی روپیہ پیسہ نہیں کہ چلے۔" فاروق نے بھی

بُرا سا منہ بنایا۔

"تو پھر کس طرح تبدیل کیے جائیں گے — بتاؤ بھی نا۔"

"ہمارے دماغوں کی یادداشتوں کی پلیٹیں صاف کی جائیں گی۔" محمود نے بتایا۔

"بہت خوب! صفائی اچھی چیز ہے۔ آج تک ہم اپنے گھر، کپڑوں اور دوسری چیزوں کی صفائی کرتے اور کراتے رہے ہیں، لیکن کبھی ہمیں یادداشت کی پلیٹوں کی صفائی کا خیال نہیں آیا تھا — ہمیں تو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ یہ خود یہ تکلیف کریں گے اور ہمیں دھلی دھلائی پلیٹیں مل جائیں گی۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"کہہ چکے — یا ابھی کچھ باقی ہے۔" محمود نے تنگ آ کر کہا۔

"شکریہ — اب کیا کہوں گا — اب تو میں صرف اپنی یادداشت کی پلیٹ صاف ہونے کا انتظار کروں گا۔"

"احمق آدمی — یہ شخص ہماری یادداشت زائل کر کے اپنی مرضی کے خیال ہمارے دماغوں میں بھر دے گا اور پھر ہم.... جو اب تک اس ملک اور قوم کے لیے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلتے رہے ہیں۔ اسی ملک اور قوم کے خلاف کام کرتے پھریں گے۔ پولیس ہمارے پیچھے ہو گی اور ابا جان بھی ہمیں نہ بچا سکیں گے۔" محمود جلدی جلدی بتاتا چلا گیا۔ اسے ڈر تھا کہ فاروق کہیں پھر بات درمیان سے نہ اُچک لے۔

"اُف.... ارے!" فاروق اور فرزانہ ایک ساتھ بول اٹھے۔

"یہ تو واقعی تھر تھر کانپنے اور لرزنے والی بات ہے۔" فرزانہ نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"ہاں ـــــ یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔" محمود بولا۔

"تو پھر آؤ . . . پہلے ذرا انہیں کانپ کر اور لرز کر تو دکھا دیں ـــــ ہو سکتا ہے، یہ خوش ہو کر اپنا ارادہ بدل لیں۔" فاروق نے کہا اور تھر تھر کانپنے لگا۔

کمرے میں موجود شخص اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اچانک وہ چیخا۔

"لے جاؤ انہیں . . . اور تینوں کو پہلی خوراک دے دو ـــــ تاکہ یہ آپریشن کے لیے تیار ہونا شروع کر دیں۔"

"پہلی خوراک ـــــ" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! دس دن تک تمہیں ہر روز ایک ایک خوراک دی جائے گی۔"

"کیا یہ مزے دار ہو گی؟"

"ہاں! رگ کے ایک ٹیکے جتنی مزیدار ـــــ" اس نے مسکرا کر کہا۔

اور وہ سمجھ گئے کہ انہیں ہر روز رگ کا ایک ٹیکہ لگایا جائے گا۔ اس مرتبہ انہیں ایک ہی کمرے میں رکھا گیا۔ پھر اچانک ان کے کمرے میں چھ آدمی گھس پڑے۔ تینوں کو دو دو آدمیوں نے جکڑ لیا۔

"اللہ ارے! یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو ـــــ ہم قربانی کے بکرے تو نہیں ہیں۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"چپ رہو ـــــ اگر کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے جان سے بھی مار سکتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے غرا کر کہا۔

"بالکل غلط! تم کسی کو جان سے نہیں مار سکتے ـــــ یہ کام تو صرف اللہ تعالیٰ

کا ہے ـــــ وہ جسے چاہے زندگی دے، جسے چاہے موت دے ـــــ تم کون ہوتے ہو جان سے مارنے والے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بکواس مت کرو۔"

اس کے ساتھ ہی فاروق کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ لگا۔ فاروق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سرد آواز میں کہا۔

"یہ تھپڑ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی فاروق نے ایک جھٹکا مارا اور ان دونوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بجلی کی طرح سے اچھلا اور اس کی ناک پر ٹکر دے ماری جس نے تھپڑ مارا تھا۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے اندر ہو گیا۔ نہ صرف محمود اور فرزانہ، بالکل پانچوں دشمن بھی بوکھلا اٹھے۔ ان کی بوکھلاہٹ سے محمود اور فرزانہ نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا کمرے میں میدانِ جنگ کا نقشہ نظر آنے لگا۔

ایک طرف تین بچے تھے اور دوسری طرف چھ لمبے تڑنگے بدمعاش ـــــ لیکن ان حالات میں بھی محمود، فاروق اور فرزانہ کے چہروں پر گھبراہٹ یا پریشانی کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔ اچانک تینوں نے ایک ساتھ ان پر حملہ کر دیا۔

فتح اور شکست

انسپکٹر جمشید کا جملہ سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ پروفیسر داؤد نے انہیں گھورا اور بولے۔

"کیا کہا تم نے... پروفیسر ریاض کے گھر کی تلاشی لو گے ــــ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔"

"میں جانتا ہوں ــــ وہ آپ کے دوست ہیں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ یہ میرے تینوں بچوں کا معاملہ ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اداس لہجے میں کہا۔

"غلط سمجھے! میں نے یہ بات اس لیے نہیں کہی کہ پروفیسر میرا دوست ہے، بلکہ اس لیے کہی تھی کہ اس کے گھر یا تجربہ گاہ کی تلاشی لینا آسان کام نہیں ہے۔ وہ ملک کا بڑا سائنس دان ہے۔ اس کے تعلقات بڑے بڑے آفیسروں سے ہیں۔ میرا خیال ہے، تمہیں تلاشی کا وارنٹ ہی نہیں ملے گا۔"

"کوئی پروا نہیں ــــ میں اس کی تجربہ گاہ کی تلاشی ہر حال میں لوں گا، اس کے لیے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"آخر کس طرح ــــ؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں ــــ بلکہ میں اسی وقت جاتا ہوں ــــ وقت ضائع

کرنا مناسب نہیں۔ نہ جانے محمود، فاروق اور فرزانہ کس حال میں ہوں ــــ" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں ــــ" خان رحمان بولے۔

"تم... ہاں تم بھی آجاؤ ــــ کوئی حرج نہیں ــــ پروفیسر صاحب آپ یہیں رہیں ــــ اگر آپ کی ضرورت پڑی تو ہم فون کر کے بلالیں گے۔"

"ٹھیک ہے ــــ فکر نہ کرو ــــ اگر پروفیسر ریاض مجرم ہے، تو اسے بچنا نہیں چاہیے ــــ اس کی تلاشی لینے کے لیے اگر تمہیں کوئی غیر قانونی کام بھی کرنا پڑے تو کر گزرنا ــــ میں دیکھ لوں گا۔" پروفیسر صاحب نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"شکریہ ــــ ایسا کرنا پڑا تو ضرور کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ خان رحمان کے ساتھ باہر نکل گئے۔ سب سے پہلے ڈی آئی جی صاحب کے پاس آئے جب انہیں معلوم ہوا کہ انسپکٹر جمشید پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ دھک سے رہ گئے اور بولے۔

"جمشید ــــ تمہارے بچے مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں۔ یوں بھی تینوں بچے قوم کے بہترین خادم ہیں۔ ان کے لیے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن کیا پروفیسر ریاض کی تلاشی کے بغیر کام نہیں چل سکتا ــــ میرا مطلب ہے ــــ اگر تمہیں اس پر شک ہے تو کیوں نہ پہلے اس کی نگرانی کرائی جائے۔ پھر اگر شک یقین میں بدلتا نظر آیا تو ہم تلاشی لے سکیں گے۔ اس طرح ہم بعد میں کی جانے والی جواب دہی سے بچ جائیں گے۔"

"لیکن اس طرح بہت دیر ہو جائے گی۔ نہ جانے مجرم کا پروگرام کیا ہے۔

ابھی تک یہ بھی تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ چاہتا کیا ہے ۔۔۔ کہیں تینوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"تو پھر بہتر ہوگا کہ تم اس سلسلے میں آئی جی صاحب سے بات کر لو۔" انہوں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"جی بہتر ۔۔۔" انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے بہت افسوس ہے ۔۔۔ مجھے معاف کر دینا جمشید میرے بچے ۔۔۔"

"میں سمجھتا ہوں جناب ۔۔۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے۔ خان رحمان بھی ان کے ساتھ تھے۔ آئی جی صاحب نے بھی ڈی آئی جی صاحب کی طرح انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں بھی بہت افسوس تھا ۔۔۔ کیونکہ انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے انہیں بھی بہت عزیز تھے، لیکن شاید پروفیسر ریاض ان کی پہنچ سے باہر تھا۔

"میں تلاشی لوں گا ۔۔۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"مگر کیسے ۔۔۔؟"

"تم دیکھ ہی لو گے ۔۔۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے۔" انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں چلوں گا ۔۔۔ کیا میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔" خان رحمان نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"ہاں ۔۔۔ دوست ہو، لیکن سوچ لو ۔۔۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب نے بھی مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

"وہ تمہارے افسر ہیں اور میں دوست ۔۔۔ دوست اور افسر میں بہت

فرق ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے بچے پروفیسر کے ہاں سے برآمد نہ ہوں ۔۔۔ اس صورت میں ہمیں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو کیا ہوا ۔۔۔ تم مجھے ڈرا کیوں رہے ہو۔" انہوں نے جھلا کر کہا۔

"میں ڈرا نہیں رہا ۔۔۔ بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اکیلا پروفیسر ریاض کے ہاں جاؤں ۔۔۔"

"اب یہ ناممکن ہے ۔۔۔ خان رحمان اب تمہارے ساتھ جائے گا۔" انہوں نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آؤ ۔۔۔"

گھر سے وہ خان رحمان کی کار میں آئے تھے ۔۔۔ اب کار کا رخ پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی طرف تھا ۔۔۔

"لیکن کیا اس وقت وہ تجربہ گاہ میں ہوگا۔"

"اس کی تجربہ گاہ اور گھر ساتھ ساتھ ہیں، بلکہ یوں کہو کہ تجربہ گاہ اوپر ہے اور رہائش نیچے ہے ۔۔۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا تم پہلے وہاں جا چکے ہو۔"

"نہیں ۔۔۔ لیکن یہ بات مجھے ضرور معلوم ہے۔"

ٹھیک دس منٹ بعد وہ تجربہ گاہ کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ گیٹ پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان چوکیدار کندھے پر بندوق رکھے کھڑا تھا۔

"ہمیں پروفیسر ریاض سے ملنا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت اچھا صاحب! آپ اپنے کارڈ دے دیں۔" اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ چوکیدار نے خان رحمان کی طرف دیکھا۔

"کیا ایک کارڈ سے کام نہیں چلے گا؟" خان رحمان نے پوچھا۔

"اگر آپ بھی پروفیسر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی کارڈ دینا ہوگا۔" اس نے کہا۔

"اچھا ......"

چوکیدار دونوں کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ جلد ہی وہ واپس آیا اور ان دونوں کو اندر لے جا کر کمرے میں بٹھا دیا۔ پھر خود باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر ریاض اندر داخل ہوئے۔

"ہیلو انسپکٹر صاحب ... اور خان رحمان صاحب ——"

دونوں نے اٹھ کر پروفیسر سے ہاتھ ملائے۔

"فرمائیے —— میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"آپ اس روز ہمیں حافظ آباد والی سڑک پر ملے تھے .... اور پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر گئے تھے۔ راستے میں میں نے آپ کو تمام واقعہ سنایا تھا۔ اس دفعہ سے میرے تینوں بچے غائب ہیں۔"

"اوہ —— یہ تو بہت افسوس ناک خبر ہے۔" پروفیسر کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں —— اس سلسلے میں چھان بین کی جا رہی ہے —— میں اس وقت آپ کی تجربہ گاہ اور کوٹھی کی تلاشی لینے آیا ہوں ——"

"کیا .... میری تجربہ گاہ اور کوٹھی کی تلاشی ——" پروفیسر ریاض اچھل پڑے۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اس سلسلے میں جن لوگوں پر شک کیا جا رہا ہے، ان میں سے ایک آپ ہیں۔"

"لیکن میرا اس اغوا کے کیس سے کیا تعلق .... اور مجھ پر شک کس بنا پر کیا جا رہا ہے۔"

"آپ عین اس وقت حافظ آباد کی سڑک پر سے کیوں گزرے جب کہ ہم وہاں کھڑے تھے۔ کیا یہ صرف ایک اتفاق تھا —— اگر نہیں تو پھر اس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔"

"انسپکٹر آپ عجیب بات سنا رہے ہیں —— خیر میں آپ کو بتا دوں کہ میری تجربہ گاہ اور کوٹھی کی تلاشی لینے کے لیے وزیر داخلہ کی اجازت درکار ہوگی —— اگر تم ان کا اجازت نامہ لے آؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"لانے کو تو میں صدر مملکت کی اجازت بھی لا سکتا ہوں، لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے، اس لیے اجازت کے بغیر ہی اگر آپ تلاشی دے دیں تو بہتر ہوگا۔"

"افسوس —— یہ نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن میرا خیال ہے، یہ ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر پروفیسر ریاض کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" پروفیسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پڑھ لیجیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

پروفیسر نے کارڈ پر نظر ڈالی اور حیران رہ گئے۔ یہ کارڈ وزیرِ داخلہ کی طرف سے انسپکٹر جمشید کو ملا ہوا تھا۔ اس کارڈ کی رو سے انسپکٹر جمشید کسی بھی ملکی معاملے میں دخل انداز ہو سکتے تھے۔ کارڈ کو پڑھنے کے بعد پروفیسر کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

"میرا خیال ہے، اب آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"ہاں! آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ لیکن آپ کا یہ کارڈ کینسل کرا دیا جائے گا۔ میں وزیرِ داخلہ سے کہوں گا کہ آپ اس کارڈ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے پھر رہے ہیں، ضرور کینسل کرا دیجئے گا۔۔۔ میں خود اس کارڈ سے تنگ آ گیا ہوں۔۔۔ لیکن اس وقت میں تلاشی ضرور لوں گا۔"

"بڑے شوق سے۔" پروفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر جمشید اور خان رحمان نے پوری تجربہ گاہ چھان ماری، پھر کوٹھی کا ایک ایک کونہ دیکھ ڈالا مگر محمود، فاروق اور فرزانہ کا انہیں کہیں نام و نشان تک نظر نہ آیا۔۔۔ جب دونوں باہر نکل رہے تھے تو پروفیسر کی نظریں ان کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ دونوں نے کوئی توجہ نہ دی اور باہر نکل آئے۔

"یہ کیا ہوا جمشید۔" خان رحمان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب کیا کرو گے۔"

"خاور احمد اور افتخار احمد کی بھی تلاشی لوں گا، لیکن اس سے پہلے ہم ذرا گھر چلیں گے۔۔۔ بیگم کو تسلی دینا بھی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

گھر سے فارغ ہو کر وہ خاور احمد کے ہاں گئے۔ خاور احمد انسپکٹر جمشید کی بات سن کر بہت حیران ہوئے، لیکن انہوں نے تلاشی دینے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ یہاں بھی کچھ نہ ملا۔ آخر دونوں حافظ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ افتخار احمد کا چہرہ انسپکٹر جمشید کی بات سن کر سرخ ہو گیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمشید۔۔۔ میں تمہارا چچا ہوں۔۔۔ مجھے تمہارے بچوں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔"

"کیا کروں چچا جان۔۔۔ سراغرسانی کے کام میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ کسی کو بھی شک سے بری نہ سمجھو۔۔۔ اس واقعے کا تعلق ایک حد تک چونکہ آپ سے بھی ہے، اس لیے تلاشی ضروری ہے۔"

"اچھی بات ہے۔۔۔ تلاشی ضرور لو۔۔۔ لیکن اس کے بعد میرے اور تمہارے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔"

"میں بعد میں آپ سے معافی مانگ لوں گا۔" انسپکٹر جمشید اداس انداز میں مسکرائے۔

"یہ میری مرضی ہے، میں معاف کروں یا نہ کروں۔" افتخار احمد نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔"

آخر اس گھر کی بھی تلاشی لی گئی اور ناکامی ہوئی۔

———*———

لڑائی اچانک اور سوچے سمجھے بغیر چھڑی تھی۔ فاروق کے منہ پر تھپڑ نہ مارا
جاتا تو اس وقت کمرے میں یہ ہڑبونگ نہ مچتی ـــــ اس وقت یوں لگ رہا تھا
جیسے نو پاگل ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں۔ سب سے پہلے فاروق کے سر کی ٹکر اس
کی ناک پر لگی تھی جس نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ فوراً ہی اس کی ناک
سے خون بہہ نکلا اور یہیں سے لڑائی شروع ہوئی۔

محمود نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اچھل کر ایک مکا اپنے قریب کھڑے دشمن
کے منہ پر دے مارا۔ فرزانہ ہوا میں ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ایک بدمعاش کی
کمر سے ٹکرائی۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گیا۔ اتنے میں تین بدمعاش بھی سنبھل چکے
تھے۔ وہ ان تینوں پر جھپٹے۔ تینوں نے ایک ساتھ جھکائی دی اور چکنی مچھلیوں کی
طرح پھسلتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ بدمعاش جھلا کر مڑے لیکن مڑتے
ہی ان میں سے تین کے سینوں پر زوردار ٹکریں لگیں اور وہ لڑکھڑا گئے۔ دوسرے
تین آگ بگولہ ہو کر آگے بڑھے اور محمود، فاروق اور فرزانہ پر ٹوٹ پڑے۔ اس
مرتبہ تینوں بچ نہ سکے۔ اور انہیں کچھ مکے اور لاتیں وصول کرنا پڑیں ـــــ مکے اور
لاتیں کھا کر انہیں عقل آگئی۔ وہ سنبھل گئے۔ فاروق چہک کر بولا۔

"بھئی واہ! کیا شاندار ہاتھ تھے۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ
لگائی اور ایک بدمعاش کی کنپٹی پر زناٹے دار تھپڑ مارتا ہوا آگے نکل گیا۔

"میں تو یہ سمجھا تھا یہ ہم سے مذاق کر رہے ہیں۔ . . . لیکن معلوم ہوتا ہے،
مذاق کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں۔" محمود نے کہا اور اس بدمعاش کی ٹانگوں میں ٹانگ
اڑا دی جو کنپٹی پر تھپڑ کھا کر فاروق کی طرف جھپٹا تھا۔ وہ دھڑام سے اوندھے منہ

گرا . . . . اس کا سر فرش سے ٹکرایا اور ایسی آواز آئی جیسی ناریل کے ٹوٹنے کی
آتی ہے۔

"محمود! تم ناریل توڑنے میں بہت ماہر ہو ـــــ مان گئی بھئی تو۔" فرزانہ
نے کہا اور بجلی کی طرح اچھل کر ایک بدمعاش کی گردن کے ساتھ جھول گئی اور اس
کا گلا گھونٹنے لگی۔

"ارے ـــــ ارے ـــــ مجھے بچاؤ ـــــ یہ شیطان کی خالہ تو میرا گلا گھونٹے
دے رہی ہے۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"تمہارا گلا نہیں گھونٹے گی تو کیا تمہارے پھیپھڑے گھونٹے گی۔" فاروق نے
مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

باتوں کے ساتھ ساتھ وہ تتلی کی طرح ناچ بھی رہے تھے اور چھ کے چھ بدمعاش
کو تگنی کا ناچ نچوا رہے تھے ـــــ چند منٹ بعد بدمعاش بے دم ہو کر فرش پر پڑے تھے
اور ان تینوں کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ اس دنیا کی
نہیں، کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ اسی وقت کمرے میں وہی آواز گونجی۔

"بہت خوب ـــــ بہت شاندار ـــــ یہ مقابلہ بہت دلچسپ تھا۔"

انہوں نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا ـــــ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ آخر
اس شخص نے ان کی لڑائی کس طرح دیکھ لی۔ وہ آوازیں تو سن سکتا تھا لیکن
انہیں لڑتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ اچانک فرزانہ سمجھ گئی اور بولی۔

"اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں ـــــ ہو سکتا ہے اس کمرے
میں ٹیلیویژن کیمرے فٹ ہوں اور ان کے ذریعے وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سب کچھ

دیکھ رہا ہو۔"

"ضرور یہی بات ہے۔" محمود بولا۔

"ہاں ___ تم ٹھیک سمجھے ___ میں بھی تمہیں ایک دلچسپ کھیل دکھاؤں گا ___ تم اسے دیکھ کر یقیناً خوش ہو گے۔" آواز آئی۔

"کیا اس کھیل کو دکھانے کا پروگرام تم پہلے ہی بنا چکے ہو؟" فرزانہ نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"نہیں ___ تمہاری لڑائی دیکھنے کے بعد پروگرام بنایا ہے ___ انہیں میرے پاس واپس لے آؤ۔ میں اسی وقت انہیں کھیل دکھانا چاہتا ہوں۔"

چھ کے چھ بدمعاشوں نے اپنی جیبوں سے پستول نکال لیے اور ان کی طرف تان لیے۔ ایک بار پھر وہ اسی کمرے میں لے جا رہے تھے جہاں سے ابھی ابھی آئے تھے۔

جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

کمرے کے بیچوں بیچ ایک ننھا سا لڑکا کھڑا تھا۔ اور کمرے کے ایک کونے میں وہ شخص ایک طرف بیٹھا تھا۔ انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے کہا:

"اگر تم تینوں اس ننھے سے لڑکے کو شکست دے سکے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر تجربہ کرنے سے پہلے تمہاری ایک ایک خواہش ضرور پوری کروں گا۔"

تینوں نے اس لڑکے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا ___ انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ آخر اس لڑکے میں ایسی کونسی طاقت بھری ہے کہ ان تینوں کو اس سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

سوانغ

ایک ایک کر کے دن گزرتے جا رہے تھے اور محمود، فاروق اور فرزانہ کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ دوسری طرف پروفیسر ریاض نے جمشید کی شکایت کر دی تھی۔ وزیر خارجہ نے انہیں بلا کر ساری بات معلوم کی تھی اور پھر صرف اتنا کہا تھا:

"پروفیسر ریاض سے الجھے بغیر اپنا کام کرتے رہو ___ میں تمہیں یقین دیتا ہوں کہ بچوں کے اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں جناب؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے اس سے پوچھا تھا ___ اس نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے تو ان بچوں کو دیکھا تک نہیں۔"

"خیر دیکھا جائے گا، اگر وہ مجرم نہیں ہے تو میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب تم کیا کرو گے بچوں کے سلسلے میں؟"

"میں جگہ جگہ چھاپے مارنے اور تلاشیاں لینے کے سوا کر ہی کیا سکتا ہوں۔"

"ہوں ___ میری خدا سے یہی دعا ہے کہ بچے مل جائیں۔"

"شکریہ جناب۔" انہوں نے کہا۔

وہ وہاں سے نکلے تو باہر اکرام ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے باہر ہی چھوڑ گئے تھے۔

"اب کہاں چلنا ہے؟"

"پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی طرف جائیں گے۔"

"لیکن اس جگہ تو ہم پہلے بھی چھان بین کر چکے ہیں۔"

"ہاں، لیکن میں ایک بار پھر تجربہ گاہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا پروفیسر ریاض اس کی اجازت دے دے گا۔" اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اجازت دے یا نہ دے میں تجربہ گاہ ضرور دیکھوں گا۔"

"بہت بہتر۔"

دونوں ایک بار پھر تجربہ گاہ کے پھاٹک پر پہنچے۔ وہی چوکیدار موجود تھا۔ وہ کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ پھر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر چلا گیا۔

"آخر تم مجھے تنگ کرنے پر کیوں تل گئے ہو۔" پروفیسر ریاض کی آواز سن کر وہ چونک اٹھے۔

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ ملاتے ہوئے انسپکٹر جمشید نے کہا:

"مجھے افسوس ہے پروفیسر صاحب! میں ایک بار پھر تجربہ گاہ کی تلاشی لوں گا ۔۔۔"

"کیا مطلب ہے؟ کیا وزیرِ داخلہ نے تم سے بات نہیں کی۔"

کی ہے جناب! لیکن ابھی تک انہوں نے میرا اجازت نامہ منسوخ

نہیں کیا ۔۔۔ یہ دیکھئے ۔۔۔ ورنہ میں کبھی نہ یہاں آتا ۔۔۔" انہوں نے کارڈ نکال کر دکھایا۔

پروفیسر ریاض کے منہ سے کئی سیکنڈ تک ایک لفظ بھی نہ نکل سکا شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کس قسم کے آدمی سے واسطہ پڑ گیا ہے۔

"ٹھیک ہے تم تلاشی لے سکتے ہو ۔۔۔ میں ایک بار پھر وزیرِ داخلہ سے بات کروں گا۔"

"ضرور کیجئے گا جناب۔"

اس مرتبہ انسپکٹر جمشید نے پوری تجربہ گاہ کے کمرے دیکھے۔ برآمدے دیکھے . . . اکرام حیران تھا کہ وہ کیا دیکھتے پھر رہے ہیں۔ آخر اس سے رہا نہ گیا، پوچھ ہی بیٹھا:

"آخر آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟"

"باہر چل کر بتاؤں گا ۔۔۔ یہاں خاموش رہو۔" انہوں نے سرگوشی میں کہا ۔۔۔

ایک گھنٹے تک جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر جمشید باہر آ گئے۔ تجربہ گاہ کے باہر آ کر انہوں نے پوری تجربہ گاہ کا ایک چکر لگایا۔ اکرام کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انسپکٹر جمشید کیا کرتے پھر رہے ہیں۔

آخر آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔" اکرام نے تنگ آ کر پوچھا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔" انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔

آخر پوری تجربہ گاہ کا چکر لگانے کے بعد وہ اکرام کی طرف مڑے

"چلو۔۔۔ اب خاور احمد صاحب کے گھر لے چلو۔"

"خاور احمد صاحب جو نقشہ نویس ہیں؟" اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ملک کے سب سے اچھے نقشہ نویس۔۔۔ میرے اچھے دوست بھی ہیں۔"

"لیکن ان سے کیا کام آن پڑا؟" اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اکرام، وقت نہیں ہے۔۔۔ سوال بعد میں کرتے رہنا۔" انہوں نے کہا اور جیپ کی طرف بڑھ گئے۔

پندرہ منٹ بعد وہ خاور احمد کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ خاور احمد نے دو منٹ بعد دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے بولے:

"معاف کیجیے گا جمشید صاحب، میں ذرا کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔۔۔ اس لیے دروازہ کھولنے میں دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کو ایک تکلیف دینے آئے ہیں۔"

"تشریف لائیے۔ اس وقت گھر میں سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ سب لوگ میرے بھائی کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔"

وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ انسپکٹر جمشید نے چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اصل مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے چند پیمائشیں بتائیں۔ ایک رقبہ بتایا۔ کچھ کمروں کی لمبائی اور چوڑائی بتائی اور پھر بولا۔

"اب مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ اتنے رقبے میں اتنے لمبے چوڑے کل کتنے کمرے بن سکتے ہیں۔"

"لیکن آخر یہ سب کس لیے پوچھ رہے ہیں؟" خاور احمد نے حیران ہو کر کہا۔

"ایک کیس کے سلسلے میں ان معلومات کی ضرورت ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"بہت بہتر! میں ابھی حساب لگاتا ہوں۔" انہوں نے کہا اور کاغذ پنسل سنبھال کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد خاور احمد نے جو جواب دیا، اس سے انسپکٹر جمشید کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ ابھی ان کے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکلا تھا کہ خاور احمد بولے:

"معاف کیجیے گا۔ میں ذرا ایک فون کر لوں۔" خاور احمد یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

عین اس وقت انسپکٹر جمشید بڑے زور سے اُچھلے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئے۔ اکرام نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید اس کمرے کے دروازے سے کان لگا چکے تھے جس میں خاور احمد فون کرنے گئے تھے۔

✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲

"کیا آپ کا خیال ہے۔ ہم تینوں اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے؟" محمود نے ہنس کر کہا۔

"ہاں! یہ تم تینوں کو وہ ناچ نچائے گا کہ ہمیشہ یاد رکھو گے۔"

"بہت خوب۔ پھر تو ہم یہ مقابلہ ضرور کریں گے تاکہ ہمیں یاد رہے ۔۔۔"

فرزانہ نے کہا۔

"چلو فاروق تم تنہا اس لڑکے سے مقابلہ کرو گے۔" محمود نے کہا۔

"مجھے اس ننھے سے بچے سے لڑتے ہوئے شرم آتی ہے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"بزدل نہ بنو" ــــ محمود نے کہا۔

"بہت اچھا" فاروق نے کہا اور اس ننھے بچے پر چھلانگ لگا دی۔

ان کا خیال تھا کہ وہ بچاؤ کے لیے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائے گا، لیکن اس نے تو ذرا بھر حرکت نہیں کی تھی۔ البتہ اپنی طرف آتے ہوئے فاروق کے سینے کی طرف مکا ضرور بڑھا دیا تھا۔ فاروق کے سینے سے مکا کیا ٹکرایا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سینے سے کوئی لوہے کا ایک من وزنی باٹ آ کر ٹکرایا ہو۔ وہ چیخ مار کر دوسری طرف الٹ گیا۔

یہ دیکھ کر محمود آگے بڑھا۔ اس نے خود کو بچاتے ہوئے لڑکے پر حملہ کرنے کی پوری کوشش کی مگر بچ نہ سکا۔ اس کے دائیں کندھے پر لڑکے کا مکا لگا اور اس کا حشر بھی فاروق جیسا ہوا۔ فرزانہ یہ سب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی لڑکا دائیں بائیں حرکت نہیں کرتا تھا۔ محمود کے گرتے ہی... اس نے ایک چکر تیزی سے کاٹا اور لڑکے کی کمر پر پہنچ کر ایک بھرپور لات اس کی کمر پر ماری دوسرے ہی لمحے لڑکا منہ کے بل زمین پر گرا اور پھر اسی طرح پڑا رہا۔

محمود، فاروق اور اس سائنس دان کا مارے حیرت کے برا حال ہو گیا۔

"بہت خوب ــــ تم بہت ذہین ہو۔ فوراً سمجھ گئیں کہ یہ انسانی بچہ نہیں،

بلکہ سائنسی بچہ ہے جو صرف آگے کی طرف ہی وار کر سکتا ہے۔ پیچھے سے ہونے والے حملے سے خود کو نہیں بچا سکتا۔" سائنس دان نے کہا:

"بہرحال... اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اب میں اس کی کمر پر بھی دو ہاتھ لگا دوں گا، لیکن اس طرح یہ انسانی بچہ نظر آ سکے گا۔"

"پھر بھی... تمہاری یہ ایجاد ہے خوب۔" محمود نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ فاروق کا بھی یہی حال تھا۔

"اس میں شرمندہ ہونے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی بھی آدمی شروع میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ انسانی بچہ نہیں ہے۔ اگر سب سے پہلے میں حملہ کرتی تو میرا بھی یہی حال ہوتا۔ بہرحال ہم یہ مقابلہ جیت گئے ہیں اور اب انہیں ہماری ایک ایک خواہش پوری کرنا ہو گی۔"

"ہاں ہاں ــــ ضرور..." اس نے کہا۔ اسی وقت پاس رکھے فون کی گھنٹی بجی ــــ اس نے ریسیور اٹھا لیا اور پھر بڑے زور سے دھاڑا:

"کیا!؟"

وہ اسے اس طرح دھاڑتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فون کا ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ اچانک اس نے زور سے تالی بجائی۔ وہ چھ بدمعاش اندر داخل ہوئے جن سے تھوڑی دیر پہلے ان کی جنگ ہوئی تھی۔ اس نے بلند آواز میں کہا:

"خطرہ سر پر پہنچ چکا ہے۔ بچنے کی صرف ایک صورت ہے... اور وہ یہ کہ ان تینوں کو مشینوں میں بند کر دو۔ مشینیں جو دوہری دیواروں

والی ہیں۔ کوئی اگر کھلوائے گا بھی تو یہ دوسری دیوار کے پیچھے ہوں گے۔"
یہ کہتے وقت اس نے انگلی سے محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرف اشارہ
کیا تھا ——

سرنگ میں

دروازے سے کان لگاتے ہی انہیں خاور احمد کی بوکھلائی ہوئی آواز
سنائی دی وہ فون میں کسی سے کہہ رہے تھے: "ہیلو!... پروفیسر.....
انسپکٹر جمشید یہاں پہنچ چکا ہے۔ اس نے یہ بات بھانپ لی ہے کہ تمہاری تجربہ گاہ
میں کچھ کمرے ایسے بھی ہیں، جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس نے کل
رقبے، ہر کمرے، برآمدوں وغیرہ کے رقبے کا حساب لگا لیا ہے اور اب
وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اتنے رقبے میں کتنے کمرے بن سکتے ہیں۔ میں نے
اسے وہی تعداد بتائی ہے جو تمہاری تجربہ گاہ کے کمروں کی ہے، لیکن میرا
خیال ہے کہ وہ کسی دوسرے نقشہ نویس کے پاس بھی جائے گا اور اس وقت
ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔" وہ خاموش ہو کر دوسری طرف سے جواب
سننے لگا۔

انسپکٹر جمشید نے دروازہ کھولنے کے لیے ایک دھکا مارا لیکن خاور احمد
نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

"اکرام! آؤ دروازہ توڑ ڈالیں وقت بہت کم ہے۔"
یہ کہتے ہی انہوں نے پیچھے ہٹ کر دروازے پر اپنے کندھے سے ایک

ٹکرماری اکرام نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ایک ساتھ دو آدمیوں کے کندھے دروازے سے ٹکرانے لگے۔ دوسری طرف خاور احمد کے ہوش اڑنے لگے تھے۔

اور جب دروازہ ٹوٹ کر دوسری طرف دھڑام سے گرا تو خاور احمد کمرے سے غائب تھا۔ البتہ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ دونوں بھاگتے ہوئے غسل خانے میں گھسے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں ایک اور دروازہ کھلا تھا جس کے ساتھ ہی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیڑھیاں اترنے لگے۔

اب وہ ایک سرنگ میں دوڑے جا رہے تھے۔ کافی فاصلے سے انہیں دوڑتے قدموں کی آواز آ رہی تھی جو یقیناً خاور احمد کی تھی۔ سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے صاف محسوس کیا کہ سرنگ بالکل پختہ بنی ہوئی تھی۔ چھ فٹ اونچی اور چار فٹ چوڑی تھی۔ اس میں سے دو آدمی برابر برابر چل سکتے تھے۔

"آخر یہ سب کیا ہے؟" اکرام نے ہانپتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"اب اس کھیل کا آخری سین ہونے والا ہے۔ اس کے بعد تم سب کچھ جان جاؤ گے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز ایسے میں بھی پرسکون تھی۔ وہ ہانپ بھی نہیں رہے تھے۔

"نہ جانے اس سرنگ کا اختتام کہاں ہو گا۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ کر فائرنگ شروع کر دے۔" اکرام نے خیال ظاہر کیا۔

"اس کے پاس پستول نہیں ہے ـــــ اگر ہوتا تو وہ پہلے ہی سرنگ میں رک کر فائر کر چکا ہوتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن جناب ـــــ سرنگ جس جگہ ختم ہو گی، اس جگہ بھی تو کوئی ہو گا اور یہ عین ممکن ہے کہ اس کے پاس پستول ہو۔"

"ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم واپس نہیں مڑیں گے، البتہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی رفتار بہت تیز کر دیں اور خاور کو پکڑ لیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اکرام بولا۔

اور دونوں نے اپنی رفتار بہت تیز کر دی ـــــ اب وہ سرنگ میں سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ خاور نے بھی شاید قدموں کی آواز اپنے نزدیک محسوس کر لی تھی۔ اس لئے اب وہ بھی جان توڑ کر بھاگ رہا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ کی دوڑ کے بعد سرنگ کا آخری سرا آ گیا۔ اس بات کا علم انہیں اس طرح ہوا کہ انہوں نے ایک دروازہ کھلتا دیکھا۔ خاور اس میں سے گزرتا نظر آیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کر سکتا، انسپکٹر جمشید نے پوری قوت سے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دروازے میں سے ہوتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گئے۔

"بس! اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔" انہوں نے کہا۔ اتنے میں اکرام بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ خاور نے انہیں بے بسی سے دیکھا اور سر جھکا دیا۔

اچانک انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ وہ حیران رہ گئے ـــــ وہ اس وقت پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ میں کھڑے تھے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ دہری دیواروں والی مشینوں کا ذکر سن کر بوکھلا اٹھے۔ محمود چلایا: "فاروق ــــ فرزانہ ــــ ہم مشینوں میں بند نہیں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" فاروق نے ایسے انداز میں کہا، جیسے اپنے گھر میں بیٹھے کسی کام کے سلسلے میں مشورہ کر رہے ہوں۔

"اگر ہم نہ چاہیں گے تو یہ کس طرح ہمیں بند کر سکتے ہیں؟" فرزانہ بولی

"دیکھتے کیا ہو ــــ انہیں بند کر کے تجربہ گاہ سے غائب ہو جاؤ ــــ پھر کسی کے فرشتے بھی یہ معلوم نہ کر سکیں گے کہ ان تینوں کا کیا بنا۔ یہ کہاں گئے۔"

چھ کے چھ بدمعاش ایک دم ان کی طرف جھپٹے ــــ مشینی بچہ ابھی تک اوندھے منہ پڑا تھا۔ کسی نے اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کیوں کہ وقتی طور پر وہ بے کار ہو چکا تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر جدوجہد شروع ہو گئی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی کوشش یہی تھی کہ مشینوں تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ وقت لگا دیں، دوسری طرف مجرم چاہتا تھا کہ وہ فوراً مشینوں کے اندر پہنچ جائیں سب سے پہلے فاروق دو بدمعاشوں کے قابو میں آیا۔ وہ اسے گھسیٹ کر کمرے کے آخری سرے پر اس کو تین مشینوں کی طرف لے چلے۔ اچانک فرزانہ نے دوڑ کر فاروق کا ہاتھ پکڑ لیا ــــ محمود نے جو فرزانہ کی یہ حرکت دیکھی تو خود بھی اس طرف لپکا اور فرزانہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چونکہ تم ہم تینوں کو الگ الگ مشین میں بند کرنا چاہتے ہو۔ اس لئے اب تمہیں پہلے ہمارے ہاتھ چھڑانے ہوں گے ــــ" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"بکو مت ــــ" ایک نے جھلا کر کہا۔

"جی بہت اچھا ــــ" فاروق نے ڈر کر کہا۔

انہوں نے ان کے ہاتھ چھڑانے کے لئے پورا زور لگایا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

"بے وقوفو! یہ کیا کر رہے ہو۔ چاقوؤں سے ان کے ہاتھ الگ کر دو۔" سائنس دان نے غرا کر کہا۔

بدمعاشوں کو بھی جیسے عقل آ گئی، فوراً ہی انہوں نے جیبوں سے چاقو نکال لئے۔ اب تینوں بے بس تھے۔ انہیں ایک دوسرے کے ہاتھ چھوڑنے ہی پڑے۔

"بہت خوب! اب انہیں چاقوؤں کے بل پر ہی آگے لے چلو۔ کہیں یہ پھر گڑبڑ نہ کریں۔" انہیں حکم دیا گیا۔

"اب کیا کریں فرزانہ ــــ" محمود نے پوچھا۔

"چلو کوئی بات نہیں ــــ اب ان کا اتنا بھی کیا دل دکھانا۔ ہو جاؤ بند مشینوں میں۔" فرزانہ مسکرائی۔

وہ چاروں کو آگے لے جانے لگا۔ وہ چلنے کی بجائے گھسٹ رہے تھے پھر جونہی انہیں مشینوں میں دھکیل کر دروازے بند کئے گئے، کمرے میں ایک آواز گونجی۔

"خبردار کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔"

انہوں نے چونک کر دیکھا ــــ انسپکٹر جمشید اور اکرام ہاتھوں میں پستول لئے کھڑے تھے۔ ان کے آگے خاور ہاتھ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

یہ دیکھ کر انہوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ پروفیسر ریاض نے گرج کر کہا

"انسپکٹر! میں تمہارا بہت لحاظ کر چکا —— اب تم دیکھو گے کہ میں کیا ہوں —— ملک میں میری کتنی چلتی ہے —— میں ابھی وزیرِ داخلہ کو فون کر کے یہاں بلاتا ہوں —— انہیں بتاؤں گا کہ تم تیسری مرتبہ میری تجربہ گاہ میں آئے ہو۔"

"ضرور بلاؤ —— مگر نہیں —— تم نہیں —— میں بلاؤں گا —— تم ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے رہو گے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔ اور میز پر رکھے فون سے نمبر ڈائیل کرنے لگا۔ ریسیور انہوں نے اٹھا کر میز پر رکھ دیا تھا —— نمبر ڈائیل کرتے ہی انہوں نے ریسیور کان سے لگایا اور جلدی جلدی پیغام دینے لگا۔ پروفیسر ریاض انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر انہوں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا:۔

"نہ صرف وزیرِ داخلہ بلکہ کچھ اور لوگ بھی آ رہے ہیں۔ اب جو کچھ کہنا ان کے سامنے ہی کہنا۔"

تین مشینیں

انہیں تقریباً آدھ گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔ آخر کچھ دیر بعد وہاں وزیرِ داخلہ، آئی جی صاحب، ڈی آئی جی صاحب، پروفیسر داؤد اور خان رحمان کے علاوہ پولیس کے کچھ آفیسر بھی جمع ہو چکے تھے اور سب حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔

"آخر بات کیا ہے جمشید —— تم نے ان لوگوں پر ریوالور کیوں تان رکھا ہے۔"

"میں بتاتا ہوں ریشانی صاحب ——" پروفیسر ریاض نے انسپکٹر جمشید کے بولنے سے پہلے کہا۔ وزیرِ داخلہ ریشانی کہلانا پسند کرتے تھے۔

"چلیئے —— آپ ہی بتایئے۔"

پروفیسر نے خوب نمک مرچ لگا کر انسپکٹر جمشید کے دو مرتبہ تلاشی لینے کے بارے میں بتایا۔ اور یہ بھی کہ اب وہ تیسری مرتبہ آئے تھے۔ اس طرح کے پستول ان کے ہاتھوں میں تھے۔

"لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ہم کس راستے سے آئے ہیں۔ اور یہ صاحب کون ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے تاجور کی طرف اشارہ کیا۔

"بات کیا ہے؟" وزیر داخلہ نے پریشان ہو کر کہا۔
"صاحب بات صرف اتنی سی ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔"

"کیا بکا!"

کیا ہی آواز سے ہال گرج اٹھا ——— وہ انسپکٹر جمشید کو گھورنے لگے۔

کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ آخر وزیر داخلہ نے کہا:۔

"جمشید! تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تینوں بچے یہاں ہیں؟ کیا تمہیں یقین ہے؟"

"جی ہاں جناب ——— میں جب اس کمرے میں داخل ہوا تو میں نے ان چھ بدمعاشوں کو ان تین مشینوں کے پاس کھڑے بری طرح ہانپتے دیکھا تھا۔ پروفیسر ریاض سے کہیے ——— وہ یہ مشین کھول کر دکھاتے۔"

"ٹھیک ہے ——— اگر بچے یہاں نہیں ہیں تو پروفیسر صاحب آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" ڈی آئی جی صاحب نے جلدی سے کہا۔

"ضرور ضرور ——— میں تیار ہوں ———" یہ کہہ کر پروفیسر ریاض مشینوں کی طرف بڑھے اور باری باری ان تینوں مشینوں کو کھول ڈالا۔
سب لوگ یہ دیکھ کر چونک اٹھے کہ مشینیں اندر سے خالی تھیں ——— بس کل پرزے ہی نظر آ رہے تھے۔

"جمشید ——— یہ کیا ——— بچے تو یہاں نہیں ہیں۔" آئی جی صاحب کے منہ سے نکلا۔

ایک لمحے کے لیے انسپکٹر جمشید بھی گھبرا گئے۔ پھر وہ آگے بڑھے۔ ان

کی نظریں کمرے کے فرش پر تھیں۔ وہ غور سے فرش کا جائزہ لے رہے تھے یہاں تک کہ وہ مشینوں کے پاس پہنچ گئے اور سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

"میں سو فی صد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بچے ان مشینوں میں ہیں۔"

کمرے میں موجود لوگوں نے یہ جملہ سن کر انسپکٹر جمشید کو اس طرح گھورا جیسے ان کا دماغ خراب ہو گیا ہو ——— وزیر داخلہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیا کہتے ہو ——— اگر بچے مشینوں میں ہی ہیں تو پھر دکھائی کیوں نہیں دے رہے؟"

"اس کا جواب میں دوں گا۔"

اچانک ایک اور آواز کمرے میں گونجی ——— سب نے مڑ کر دیکھا ——— یہ پروفیسر داؤد تھے۔ وہ پر وقار انداز میں چلتے ہوئے مشینوں کی طرف بڑھے اور پھر ذرا جھک کر بولے:۔

"کیا مجھے اجازت ہے؟"

"جی ہاں ——— کیوں نہیں ——— اگر آپ اس مسئلے کو حل کر دیں تو اور کیا چاہیے۔" آئی جی صاحب بول اٹھے۔

"تو پھر سنیے ——— یہ مشینیں دماغ بدلنے کی مشینیں ہیں۔ میں ان سے اور ان کے کام سے اچھی طرح واقف ہوں ——— ان میں دہری دیواریں لگائی جاتی ہیں ———"

"دماغ بدلنے کی!!" کئی آوازیں ابھریں۔

"ہاں! آپ کو اس مشین میں سے بند کر کے اگر کچھ بٹن دبا دیے

جائیں تو پھر خود بخود یادداشت کی پلیٹ صاف ہو جائے گی اور اس پلیٹ پر اپنی مرضی کے خیالات محفوظ کئے جا سکتے ہیں ۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"تو ۔۔۔ تو کیا محمود، فاروق اور فرزانہ کی یادداشت ۔۔۔" انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ ان کا رنگ فق ہو گیا۔

"نہیں ۔۔۔ ابھی بٹن نہیں دبائے گئے ۔۔۔ تم عین وقت یہاں پہنچ گئے شاید ۔۔۔" پروفیسر داؤد نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر خدا کے لئے ان مشینوں کو کھول ڈالیے ۔۔۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

پروفیسر داؤد نے کچھ بٹن دبائے اور پھر انہوں نے دیکھا ۔۔۔ تینوں مشینوں میں محمود، فاروق اور فرزانہ بند تھے۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں اس طرح کھڑے تھے جیسے بت ہوں۔ انہیں باہر نکالا گیا۔ اب سب پروفیسر ریاض کو گھور رہے تھے۔ وزیر داخلہ کا حال سب سے برا تھا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ پروفیسر ریاض کے چیتھڑے اڑا دیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا دوست اور ملک کا مشہور سائنس دان ایک مجرم بھی ہو سکتا ہے۔

پروفیسر داؤد کی کوشش سے تینوں بچے جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ ان کی نظریں جونہی ان سب پر پڑیں، وہ حیران رہ گئے۔ خادر احمد کو وہاں ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ محمود نے کہا:۔

"ابا جان ۔۔۔ یہ ہمارے دوست کے والد یہاں ہاتھ اٹھائے کیوں کھڑے ہیں۔ کیا یہ بھی پروفیسر ریاض کے ساتھی ہیں؟"

"ہاں بیٹا! یہ اور پروفیسر ریاض دونوں دشمن ملک کے جاسوس ہیں۔ ملک کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ اس سے پہلے نہ جانے کیا کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ انہیں یہ حکم ملا تھا کہ تم تینوں کو اغوا کر کے تمہارے ذہن بدل دیے جائیں تاکہ میں تمہارے غم میں پاگل ہو جاؤں اور ان کے راستے کا کانٹا نکل جائے۔ کیونکہ انہیں میری طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ تمہیں اغوا کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ باقاعدہ پروگرام بنایا گیا۔ در صاحب نے بیٹے کی سالگرہ کی تاریخ مقرر کر دی۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی انہوں نے سالگرہ نہیں منائی تھی۔ حافظ آباد سے ایک تار افتخار احمد کے نام سے دیا گیا۔ تاکہ میں وہاں روانہ ہوں اور بچے خادر کے ہاں چلے جائیں۔ تاکہ اسی جگہ تمہیں غائب کر دیا جائے۔"

"اس جگہ سے کیا مطلب؟" فرزانہ نے چونک کر پوچھا۔

"خادر کے کمرے کے غسل خانے میں ایک سرنگ کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ سرنگ یہاں تک آتی ہے۔ دونوں کوٹھیوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ ۔۔۔ تو اسی لئے سالگرہ والے روز میں نے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سنی تھی ۔۔۔ خادر صاحب شاید اس وقت نہانے کی بجائے یہاں آتے ہوتے تھے۔" فرزانہ کو یاد آ گیا۔

"ضرور یہی بات ہوگی — بہر حال انہیں جب معلوم ہوا کہ
تم تینوں کی بجائے دو سالگرہ میں شریک ہو رہے ہیں تو خاور کو فوراً سرنگ
کے ذریعے پروفیسر ریاض کے پاس آنا پڑا تھا تاکہ محمود کا کچھ کیا جا سکے۔ عین اس
وقت میں نے حافظ آباد سے فون کیا۔ ادھر یہ واپس آ گئے۔ میرے فون
کی وجہ سے تم دونوں کو اسی گھر سے اغوا نہ کیا جا سکا —— ورنہ پروگرام تو یہی
تھا کہ پارٹی کے ختم ہونے کے بعد تم تینوں کو غسل خانے کے راستے غائب کر
دیا جائے گا —— لیکن ہوا الٹ —— میں ان کی امید سے بہت پہلے
حافظ آباد پہنچ گیا اور وہاں جا کر معلوم ہوا کہ افتخار احمد تو زندہ ہیں —— بس
میں نے فوراً فون کر دیا۔ تم دونوں کے گھر میں پروفیسر خود ہی پہنچ چکے تھے۔
ان کے ساتھی مکان سے باہر تھے۔ محمود کو پہلے ہی بے ہوش کیا جا چکا تھا۔
ان کے پاس بے ہوش کرنے کے آلے موجود ہیں، جن سے شعاعیں نکلتی ہیں
اگر آدمی تھکا ہوا ہو تو شعاعیں بہت جلد اثر کرتی ہیں —— یہ بات
مجھے خود پروفیسر نے بتائی تھی۔ ہم افراتفری میں حافظ آباد سے روانہ ہوئے
تو راستے میں رکاوٹ کھڑی کی گئی۔ میری موٹر سائیکل اڑا لی گئی۔ یہ باتیں میں
بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا —— خیر —— صبح سے پہلے میں جنگل
سے روانہ نہ ہو سکا —— صبح سویرے پروفیسر ریاض آتے نظر آئے۔ انہوں
نے بتایا کہ وہ حافظ آباد سے آگے ایک جگہ گئے تھے۔ ان سے لفٹ لی
گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ یہ تھی کل کہانی —— اب رہا یہ سوال کہ انہیں
یہ کیسے معلوم ہوا کہ افتخار احمد میرے رشتے دار ہیں —— تو یہ بات مجھے بعد

میں یاد آئی —— کئی سال پہلے کی بات ہے —— افتخار احمد کو
ایک مکان کا نقشہ بنوانا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ذکر کیا —— میں
نے انہیں خاور احمد کے پاس بھیج دیا۔ اس طرح خاور احمد کو معلوم تھا کہ
وہ میرے رشتے دار ہیں۔ میں نے ان تینوں کی تلاشی لی تھی لیکن تم تینوں کا
پتہ نہ چلا تھا۔ میرا اطمینان نہ ہوا، میں نے ایک بار پھر پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ
کا جائزہ لیا —— اس وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ کہیں تجربہ گاہ
میں کوئی خفیہ کمرہ تو نہیں —— اس خیال کے پیش نظر میں نے تمام کمروں
کی اپنے قدموں کے ذریعے پیمائش کی اور کل رقبے کا اندازہ لگایا۔ پھر اس نتیجے
پر پہنچا کہ جتنے کمرے ہونے چاہئیں اس سے کم ہیں —— بالکل صحیح نتیجے
پر پہنچنے کے لیے میں خاور صاحب کے پاس گیا کیونکہ یہ بہت ماہر نقشہ نویس
ہیں —— اور جب انہوں نے وہی تعداد بتائی جو تجربہ گاہ کے کمروں کی
تھی تو میں بہت مایوس ہوا۔ عین اس وقت مجھے یاد آ گیا کہ خاور کو یہ معلوم
ہے کہ افتخار احمد میرے رشتے دار ہیں۔ بس پھر کیا تھا، پورا نقشہ میرے ذہن
میں صاف ہو گیا۔ کڑی سے کڑی مل گئی۔ دوسری طرف خاور فون کرنے کے
لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا —— ہم بھی کمرے کے دروازے سے
کان لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اور ہم نے سنا یہ پروفیسر ریاض کو بتا رہا تھا کہ
میں ان کے گھر پہنچ گیا ہوں —— ہم نے دروازہ توڑنا شروع کیا تو
یہ سرنگ کا دروازہ کھول کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آخر ہم بھی یہاں پہنچ
گئے —— اگر تجربہ گاہ کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو آپ لوگ میرے فون کرنے

کے باوجود یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے ـــــــ آپ باہر نکل کر اس کمرے کا دروازہ بند کر کے دیکھ لیں ـــــــ آپ کو باہر سے اس کمرے کا نام ونشان تک نظر نہیں آئے گا ـــــــ"

انسپکٹر جمشید کی کہانی سن کر سب دنگ رہ گئے۔ پھر انھوں نے باہر نکل کر دروازہ بند کر کے دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب ان کے سامنے صرف ایک دیوار تھی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے ـــــــ ہم تو یہ سوچ رہے تھے، بس اب ہمارے دماغ الٹ جائیں گے اور ہم اپنے ملک اور قوم کے خلاف کام کرتے پھریں گے۔ پھر ابا جان ہمیں گرفتار کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کریں گے اور اس طرح ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں گے۔ لیکن خدا کی قدرت تو دیکھیے کہ اب سلاخوں کے پیچھے وہ نظر آئیں گے جو اس ملک میں بہت بڑی حیثیت کے آدمی ہیں ـــــــ جو ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے ـــــــ" فاروق کہتا چلا گیا۔

"ارے! ہم اسے تو بھول ہی گئے۔" اچانک محمود کے منہ سے نکلا۔

"کسے؟" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اس مشینی بچے کو ـــــــ"

"مشینی بچہ ـــــــ کیا مطلب ـــــــ" کئی آوازیں ابھریں۔

اور وہ انہیں مشینی بچے سے اپنی لڑائی کی تفصیل بتانے لگے جس پر خوب قہقہے لگے اور اس طرح یہ چکر ختم ہوا۔

اشتیاق احمد
کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی
سے بھرپور ناول
اس ماہ کے ناول
موت کا غار — انسپکٹر جمشید سیریز — ۱۸ روپے
قاتل عمارت — ۱۸
محمود، فاروق، فرزانہ کا اغوا — ۱۰
پہاڑوں میں موت — ۱۰
موت کی سرنگ — ۱۰
بنک کے ڈاکو — ۱۰
شیطان کی آمد — انسپکٹر ارسلان سیریز کا خاص نمبر — ۱۶
آئندہ ماہ کے ناول
آواز کے شکار — تینوں پارٹیاں — ۱۸ روپے
آواز کی موت — ۱۸
خون کی تحریر — انسپکٹر جمشید سیریز — ۱۰
ہنگامے کی موت — ۱۰
لوہے کا آدمی — ۱۰
فرضی قتل — ۱۰
جاسوسوں کا شہر — انسپکٹر ارسلان سیریز — ۱۶
اشتیاق پبلی کیشنز
برانچ آفس
بازار لوہاراں ○ جھنگ صدر
فون: ۳۲۹۵

محمود، فاروق، فرزانہ
اور انسپکٹر جمشید
سیریز
725

تین طرف سے حملہ

اشتیاق احمد

دو باتیں

السلام علیکم!

یہ ہے تین طرف سے حملہ...... کس کس طرف سے یہ آپ پڑھ کر جان لیجئے...... محمود، فاروق، فرزانہ کو آپ ایک نئے انداز میں پائیں گے...... کہانی کی رفتار اور اتار چڑھاؤ آپ پر ہر طرف سے حملہ آور ہو جائیں گے...... ویسے ہی جیسے میں آج کل حملوں کی زد میں ہوں...... نہیں نہیں...... یہ ویسے حملے نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ حملے ہیں آپ کے خطوط کے...... ڈاک کے...... جہاں تک حملوں کا سوال ہے ان کی زد میں تو آج کل پورا ملک ہے...... اس ماہ آپ کو "تین طرف سے حملہ" کے ساتھ "رنگین خطرہ" اور "پیتل کا مجسمہ" کے علاوہ باطل قیامت کے سلسلے کی چوتھی قسط "ایمان کے محافظ" بھی پڑھنے کو ملے گی...... یعنی چار ناول ایک ساتھ مل کر آپ پر حملہ کریں گے...... ہائیں...... یہ تو چار طرف سے حملہ ہو گیا...... تو اب کر دیجئے جوابی حملہ ناولوں پر۔

اشتیاق احمد

پھنس گئے

وہ عجیب آواز سن کر محمود کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس وقت وہ گھر میں بالکل تنہا تھا۔ انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید ایک عزیز کی بیماری کے لئے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے ایسے میں فاروق اور فرزانہ کو ایک دوست کی سالگرہ میں جانا پڑ گیا۔ دوست نے بلایا تو تینوں کو ہی تھا لیکن کافی دیر تک لڑنے اور جھگڑنے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ گھر کی نگرانی کے لئے بھی ان تینوں میں سے کسی ایک کو رکنا چاہیے۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ گھر میں کون رہے۔ تینوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ قرعہ اندازی کر لی جائے۔ جس کے نام کی پرچی کھلے، وہی گھر میں رہے۔

تینوں پرچیاں ڈالی گئیں۔ محمود نے آنکھیں بند کر کے ایک پرچی اٹھائی، اسے کھولا تو اسی کا نام نکلا۔ اب وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ فاروق اور فرزانہ اس کا مذاق اڑاتے، قہقہے لگاتے گھر سے نکل گئے اور وہ بالکل اکیلا رہ گیا۔

پورے گھر میں سناٹا طاری ہو گیا۔ اس نے گھر کا دروازہ بند کیا، اپنے کمرے کی بائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی بند کی اور پھر ڈرائنگ روم میں آ کر ایک صوفے پر لیٹ گیا...... اب اسے جاسوسی ناول پڑھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ فاروق اور فرزانہ کو رات گئے لوٹنا تھا جب کہ ان کے والدین صبح سویرے آنے والے تھے......

سردیوں کے دن تھے اور دسمبر کی آخری راتیں، سردی اپنا لوہا منوانے پر تل گئی تھی۔ محمود کو سردی کا احساس ہوا تو اس نے آتش دان میں لگا ہیٹر کا سوئچ آن کر دیا، ہیٹر روشن ہو گیا اور کمرے سے سردی اڑنچھو ہونے لگی۔

یہی وقت تھا جب اس نے وہ عجیب سی آواز سنی تھی۔ ناول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ کان کھڑے ہو گئے...... دل دھک دھک کرنے لگا...... پہلا خیال جو اسے آیا، وہ یہ تھا کہ کیا اس کے کان بجے ہیں۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند ہے، کھڑکی بھی بند ہے، گھر کے اندر داخل ہونے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں، پھر بھلا گھر میں کوئی آواز کیسے گونج سکتی ہے...... پالتو بلی کے کودنے سے تو آواز پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔

بہرحال وہ آواز بالکل ایسی تھی جیسے کوئی کودا ہو۔ محمود کے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ تیزی سے اٹھا، کمرے سے نکلا اور صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا، دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا، بائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا:

"کیا کچھ ہونے والا ہے...... کیا کوئی خطرہ ہمارے گھر پر منڈلا رہا ہے۔"

اس کے دل نے جواب دیا:

اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا، دبے پاؤں دوسرے
کمرے کی طرف بڑھا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا۔ پھر وہ باورچی خانے میں گیا، وہاں
بھی کوئی نہیں تھا۔

اب دیکھنے کے لیے صرف ایک کمرہ رہ گیا تھا اور وہ تھا اس کے والد کا
کمرہ...... پنجوں کے بل چلتا ہوا وہ اس طرف بڑھا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل
ہونے سے پہلے اس نے جھانک کر دیکھا...... اندر کوئی بھی تو نہیں تھا ڈرتے
ڈرتے اندر داخل ہوا۔ دروازے کے پیچھے اور باتھ روم میں ایک نظر ڈالی،
مایوسی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

"تو مجھے واقعی وہم ہو گیا تھا"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

پھر مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا...... بے خیالی میں صوفے پر بیٹھ
گیا اور قالین پر پڑا ہوا ناول اٹھا لیا۔ اب وہ پھر ناول میں محو ہو چکا تھا تھوڑی دیر
پہلے کی اپنی حرکات پر اسے ہنسی آ رہی تھی اور ناول کے ساتھ ساتھ وہ سوچ رہا
تھا...... ہم تو سچ مچ جاسوس بنتے جا رہے ہیں۔

پھر اچانک ہی اسے سردی کا احساس ہوا۔ اس نے حیران ہو کر
آتشدان کی طرف دیکھا اور پھر...... اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کمرے کا بلب روشن تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جو ہیٹر
چلایا تھا، اب بجھا پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں فوراً ہی خیال آیا، شاید ہیٹر میں کوئی
خرابی واقع ہو گئی ہے۔

لیکن...... نہیں...... ہیٹر کا سوئچ تو اٹھا ہوا تھا جب کہ تھوڑی دیر پہلے
سوئچ اس نے خود دبایا تھا۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہو گیا۔ یہ حقیقت اس پر روشن ہو گئی کہ اس نے
تھوڑی دیر پہلے جو آواز سنی تھی، وہ اس کا وہم نہیں تھا۔ کسی نے ہیٹر کا سوئچ اوپر
اٹھایا...... اس کا مطلب تھا...... گھر میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔

اس کے ماتھے پر سردی کے عالم میں بھی پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔
اس نے آہستگی سے ناول تپائی پر رکھ دیا۔ ایک بار پھر وہ دروازے پر آیا، پھر
اپنے کمرے میں گیا، کھڑکی کھول کر باہر جھانکا...... ہر طرف سناٹا تھا۔ ابھی رات
کے صرف نو بجے تھے، لیکن سردی کے موسم میں نو بجے بھی یوں لگتا ہے جیسے آدھی
رات کا سماں ہو...... باہر کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ ہو کا عالم طاری تھا، کھڑکی بند
کر کے وہ پلٹا۔ اس نے خود سے کہا:

"یار محمود...... میں آج یہ کس چکر میں پھنس گیا، گھر میں کوئی بھوت تو
نہیں گھس آیا؟"

بھوت کے خیال پر وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ بھوت پریت پر انہوں
نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ اگرچہ کئی کیسوں کے سلسلے میں انہیں آسیب زدہ
مکانوں وغیرہ سے واسطہ بھی پڑا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا...... میں نے چھت کا
جائزہ تو لیا ہی نہیں۔

اس خیال کا آنا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھنے
لگا...... چھت بھی سنسان تھی۔ اس نے ایک ایک کونا دیکھ ڈالا۔ پچھلی دیوار پر کوئی
پانی کا پائپ بھی نہیں تھا جس سے یہ سوچا جا سکتا کہ شاید کوئی پائپ کے ذریعے
اوپر چڑھ آیا ہو۔ پائیں باغ کا کوئی درخت بھی چھت کی منڈیر تک نہیں پہنچتا تھا،
اس لیے اس نے نہ پچھلی دیوار کا جائزہ لیا اور نہ پائیں باغ کے ساتھ والی دیوار
کا، بس چھت کو غور سے دیکھا اور نیچے اترنے لگا۔

اچانک اس کے قدم رک گئے۔۔۔

صحن میں بچھی میز کے سامنے کرسی پر کوئی بیٹھا تھا۔ اس کا رخ اس کی طرف تھی۔ محمود گرتے گرتے بچا۔۔۔ ابھی چند لمحے پہلے جب وہ میز کے پاس سے اوپر گیا تھا تو صحن میں کوئی بھی نہیں تھا اور اس سے پہلے وہ پورے مکان کا جائزہ لے چکا تھا۔ لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔

محمود نے دیکھا، اس کے جسم پر سیاہ لباس تھا۔ سر پر سیاہ ہیٹ تھا۔ میز کی سطح پر دونوں ہاتھ رکھے وہ اس طرح اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ محمود کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے ذہن کو تیزی سے گردش دی اور سوچا۔۔۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔۔۔ تنہا ہونے کا احساس اس کی رگ رگ میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

اس نے سوچا:

''کاش! اس وقت فاروق اور فرزانہ بھی یہاں ہوتے۔ اس صورت میں وہ اس کا مقابلہ بڑی آسانی سے کر سکتا تھا پھر اسے پروفیسر داؤد کے دیے ہوئے کھلونا نما ہتھیار یاد آئے۔۔۔ ہتھیار پائیں باغ والے ان کے کمرے میں رکھے تھے اور اب وہ اس اجنبی کے سامنے سے گزرے بغیر اپنے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کوئی ہتھیار حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

آخر اس نے سوچا۔۔۔

اس طرح ہمت ہارنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ خود کو پرسکون رکھ کر آگے بڑھو اور دیکھو کہ یہ کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اور گھر میں کس طرح داخل ہوا ہے؟ دروازہ اور کھڑکی تو ابھی تک اندر سے بند تھے۔۔۔ تو کیا۔۔۔ یہ شخص ہوا میں اڑتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔۔۔ یا پھر یہ کوئی جادوگر ہے۔۔۔ کہیں یہ سچ مچ کوئی

بھوت ہی تو نہیں۔۔۔

سر کو ایک زوردار جھٹکا دے کر اس نے ان خیالات سے پیچھا چھڑایا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ ایسے میں اس نے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنی۔۔۔ اور پھر وہ چلتے چلتے ایک دم اس کے سامنے پہنچ گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ کئی انچ اونچا اچھل گیا۔۔۔ مارے خوف کے اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔۔۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے دیکھا اس شخص کے چہرے پر ایک بے رحم اور سفاک مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو بڑے سے بڑے بہادر آدمی کا پتہ پانی بنا دینے کے لئے کافی تھی۔

☆☆☆

فاروق اور فرزانہ اپنے دوست طاہر احمد کے گھر پہنچے۔ پورا گھر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ طاہر احمد دروازے کے اندر تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ دوستوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ طاہر احمد انہیں دیکھ کر کھل اُٹھا۔ اس نے فاروق سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرزانہ سے کہا:

''کیسی ہو بہن!''

''ٹھیک ہوں۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''ارے محمود نہیں آیا۔'' طاہر احمد کے منہ سے نکلا۔

"امی ابو گھر میں نہیں تھے، اسے گھر کی حفاظت کے خیال سے پھر آنا پڑا۔" فاروق نے کہا۔

"لیکن اس نے یہ منظور کیسے کر لیا؟" طاہر احمد نے پوچھا۔

"قرعہ اندازی کے ذریعے۔" فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے ابو کہاں ہیں..... ان سے ملے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا۔" فاروق نے کہا۔

"وہ نہانے گئے تھے۔ نہ جانے ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ آؤ میں تمہیں ان کے پاس لے چلتا ہوں۔" طاہر احمد بولا۔

وہ اس کے ساتھ چل پڑے، طاہر احمد کے والد خاور احمد ایک بہت مشہور نقشہ نویس تھے۔ لمبے چوڑے اور سانولے سے رنگ کے آدمی تھے۔ ان سے بہت خوش ہو کر ملتے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ تینوں کئی مرتبہ ان کے گھر آ چکے تھے۔ لیکن سالگرہ کے موقع پر آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ خود طاہر اور اس کے والد بھی دو تین مرتبہ ان کے گھر آ چکے تھے۔ انسپکٹر جمشید بھی ان سے واقف تھے۔

"ارے بابا! ابا جان تو ابھی تک نہا رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں..... آؤ ہم چلیں..... باہر ہی مل لیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"نہیں..... ہم یہیں ٹھہرتے ہیں..... ان سے اسی کمرے میں ملواؤں گا۔"

طاہر نے کہا اور وہ وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ غسل خانے میں برابر پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں فرزانہ پریشان ہو گئی۔

"طاہر بھائی..... ذرا غسل خانے کے دروازے پر جا کر اپنے ابو کو

آواز تو دیں۔"

"کیوں!" طاہر نے حیران ہو کر کہا۔

"پہلے آواز تو دیں..... پھر وجہ بتاؤں گی۔"

طاہر نے اُسے عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر غسل خانے کے دروازے پر جا کر آواز دی۔

"ابو.....!"

کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے فرزانہ اور فاروق کی طرف دیکھا اور پھر ذرا بلند آواز میں آواز دی۔

"ابو..... کیا آپ نہا چکے ہیں؟"

"بس بیٹے..... ابھی آتا ہوں....." اندر سے آواز آئی۔

طاہر مطمئن ہو کر واپس پلٹا اور فرزانہ سے بولا:

"ہاں فرزانہ بہن! اب بتاؤ..... کیا بات تھی؟"

"کچھ بھی نہیں..... مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے غسل خانے میں کوئی نہ ہو..... لیکن میرا خیال غلط تھا۔"

"مگر تمہیں ایسا محسوس کس طرح ہوا؟" طاہر ابھی تک حیران تھا۔

"چھوڑو یار..... اس کی تو عادت ہے، بات بے بات کچھ نہ کچھ محسوس کرتی رہتی ہے۔"

اسی وقت کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ طاہر نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا پھر فاروق کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

"تمہارا فون ہے....."

ہو کر کہا۔

''میرا...... بھلا مجھے یہاں کون فون کر سکتا ہے۔'' فاروق نے حیر

ساتھ ہی اس نے ریسیور کان سے لگایا۔ پھر اس طرح اچھلا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔

-----☆☆☆-----

بیگم جمشید غائب

انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید ٹرین سے اتر کر ایک ٹیکسی کے ذریعے اپنے عزیز کے گھر پہنچے۔ عزیز کا نام افتخار احمد تھا اور وہ ان کے رشتے کے چچا تھے۔ انہی کی وفات کی خبر سن کر انہیں یہاں آنا پڑا تھا۔ افتخار احمد کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے حیرت بھری نظر ادھر اُدھر ڈالی۔ رات کافی ڈھل چکی تھی، لیکن پھر بھی گھر کے اندر روشنی ہونی چاہیے تھی۔ جس گھر میں کوئی فوت ہو جائے، وہاں کے سب لوگ اس طرح تو نہیں سو جاتے کہ پورے گھر میں کوئی ہل چل نظر نہ آئے۔ یہاں عالم یہ تھا کہ پورا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے گھر والے گھوڑے بیچ کر سوئے ہوں۔

آخر انہوں نے بے تابی کے عالم میں دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کہیں جا کر اندر روشنی ہوئی۔

''معلوم ہوتا ہے، ہم کسی چکر میں پھنس گئے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب؟''

ابھی انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور پھر وہ

...ت سے رہ گئے ...... ان کے چچا افتخار احمد ان کے سامنے کھڑے تھے اور
گھور کر انہیں دیکھ رہے تھے۔

"جمشید ...... یہ تم ہو۔" ان کی آواز میں بلا کی حیرت تھی۔

"جی ہاں ...... السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام ...... خیر تو ہے۔"

"شاید ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور جلدی جلدی ساری بات انہیں بتا دی۔ افتخار احمد نے بوکھلا کر خود کو ٹٹولا کہ کہیں وہ سچ مچ مر تو نہیں چکے۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید بولے:

"اوہ ...... خطرہ سروں پر منڈلا رہا ہے۔ کیا یہاں سے فون کال ہو سکتی ہے؟ دراصل میرے موبائل کی بیٹری جواب دے چکی ہے۔"

"فون کال ...... ہاں کیوں نہیں ......"

"اوہ ...... او تو پھر جلدی کیجیے ......"

افتخار احمد انہیں ساتھ لے کر فون کے پاس آئے۔ انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی محمود اور فاروق کے دوست طاہر کے والد خاور احمد کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ بیگم جمشید کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ دوسری طرف افتخار احمد گھر کے دوسرے افراد کو جگا چکے تھے۔ گھر کی عورتیں بیگم جمشید کے پاس پہنچ گئی تھیں ...... اچانک انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"محمود ...... گھر میں اکیلا ہے ...... فاروق اور فرزانہ خاور احمد کے گھر پارٹی میں ہوں گے۔ ہم یہاں ہیں، اس کا صاف مطلب ہے کہ محمود خطرے میں ہے۔ اف خدا ...... مم ...... مگر یہ کیسے ممکن ہے ......؟"

"کیا ...... کیسے ممکن ہے ...... آپ کیا سوچ رہے ہیں۔" بیگم جمشید الجھ کر بولیں۔

"جس نے بھی ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہے، اسے یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم حافظ آباد روانہ ہو جائیں گے، لیکن اسے یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ عین اسی دن، اسی وقت فاروق اور فرزانہ پارٹی میں جائیں گے ...... آخر یہ کیسے ممکن ہے۔ بہر حال یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پروگرام بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے۔ نجانے وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟"

"خدا خیر کرے۔"

عین اسی وقت نمبر مل گیا۔ انہوں نے کہا:

"ہیلو ...... فاروق ...... میں حافظ آباد سے بول رہا ہوں۔ تم دونوں فوراً گھر پہنچو ...... محمود خطرے میں ہے۔"

"جی!" دوسری طرف سے فاروق کے منہ سے نکلا، لیکن انسپکٹر جمشید وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور افتخار احمد سے معذرت کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔ افتخار احمد ان کے پیچھے پیچھے آئے اور بولے:

"لیکن اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی، نہ کوئی بس جاتی ہے۔"

"تو پھر ...... اب کیا کیا جائے ...... میرا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"اس کا اب صرف ایک ہی حل ہے۔ میری کار لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے ...... لیکن کیا اس میں اتنا پیٹرول ہوگا۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتا ...... پرسوں ڈلوایا تھا ...... لیکن میرے پاس اس کا بھی حل ہے ...... پٹرول کا ایک گیلن گھر میں موجود ہے۔"

''بہت خوب ...... تو پھر ذرا جلدی کیجئے۔''

چند منٹ بعد انسپکٹر جمشید بیگم جمشید کے ساتھ کار پر اڑے جا رہے تھے۔ اس سڑک پر سفر کرنے کا یہ ان کا پہلا اتفاق تھا۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے جنگل تھے، لیکن ...... انسپکٹر جمشید ہر خطرے سے بے نیاز پوری رفتار سے کار اڑائے لئے جا رہے تھے۔ انہیں اس بات کی بھی فکر نہیں تھی کہ اگر پٹرول ختم ہو گیا تو کیا ہوگا۔ کیونکہ پٹرول کا ایک گیلن ڈگی میں رکھا تھا۔

اچانک ان کی نظر دور ...... بہت دور سڑک پر پڑی۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں انہوں نے اس موٹے سے رسے کو صاف دیکھا تھا جو سڑک کے آر پار شاید دو درختوں سے بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے یکلخت بریک دیے۔

''کیا ہوا ......؟'' بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

''خطرہ ......!'' انہوں نے کہا:

ہم گھر گئے ہیں۔ اس جال کا گھیرا لمحہ بہ لمحہ تنگ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے غلط اندازے لگائے تھے۔ یہ پورا پروگرام بڑے زبردست دماغ نے تیار کیا ہے۔''

''لیکن یہاں خطرہ کہاں ہے؟'' بیگم جمشید نے پوچھا۔

''وہ دیکھو ...... سامنے سڑک پر رسا بندھا ہے۔''

''اوہ!'' ان کے منہ سے نکلا۔

''اور اب تو میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے فاروق اور فرزانہ کو گھر بھیج کر بھی غلطی کی ہے ...... ضرور انہیں بھی راستے میں گھیرا جائے گا۔''

''اُف خدا ...... یہ سب کیا ہے ...... تین طرف سے حملہ ......'' بیگم جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

''ہمت ہارنے سے کچھ نہیں ہوگا ...... ایسے موقعوں پر اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے عقل اور ہوش سے کام لینا چاہئے۔''

''لیکن یہاں نظر تو کوئی نہیں آتا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے جن لوگوں نے رسا باندھا ہے، وہ یہاں نہیں ہوں گے ...... وہ نہیں ہیں۔ لیکن ہم چونکہ کافی دور رک گئے ہیں، اس لئے وہ ابھی سامنے نہیں آئے۔''

''تو پھر چلئے ...... واپس چلتے ہیں'' بیگم جمشید نے تجویز پیش کی۔

''واپس ...... نہیں واپس تو اب نہیں جائیں گے ...... محمود، فاروق اور فرزانہ کی زندگی بھی خطرے میں ہے اور اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ہماری زندگی کس کام کی ......''

''پھر آپ کیا کریں گے؟''

''ہم آگے بڑھیں گے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''کیا آپ کے پاس پستول ہے۔''

''بھلا کسی کی وفات کی خبر سن کر بھی کوئی پستول لیکر چلا کرتا ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اوہ ...... پھر آپ ان لوگوں سے کیسے مقابلہ کریں گے۔''

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' انہوں نے کہا اور کار چلا دی۔ اور اب وہ درمیانی رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ بیگم جمشید کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ انہیں اپنا نہیں، محمود، فاروق اور فرزانہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر ہم اس جنگل سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو بچوں کا کیا بنے گا؟۔

کار رُکنے سے پہلے پاس پہنچ کر رُک گئی۔ انسپکٹر جمشید نے
دیکھا...... کسی طرف دشمن کے آثار نظر آئے۔ اب تو وہ بہت حیران
کار سے اُتر آئے اور دائیں طرف والے اس درخت کی طرف بڑھے
رستا بند حا تھا۔ انہوں نے دیکھا۔ وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ
گئے۔ پھر جونہی وہ رستا کھول کر مڑے، ان کی سٹی گم ہو گئی۔ ابھی چند لمحے
سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی، سیٹ پر بیگم جمشید بیٹھی تھیں، لیکن اب
جمشید وہاں نہیں تھیں۔

☆☆☆

فون کا ریسیور کان سے لگاتے ہی فاروق بُری طرح اُچھلا تو فرزانہ
حیران رہ گئی۔ اس نے گھبرا کر کہا:
''کیا ہوا فاروق...... کیا ریسیور میں کرنٹ دوڑ گیا ہے یا اندر سے کسی
بچھو نے ڈنک مار دیا ہے۔''
فاروق نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو فون پر کسی کی بات
سن رہا تھا۔ آخر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس دم فرزانہ کو اس کی چہرہ زرد زرد
لگا۔ اس نے بوکھلا کر کہا:
''کیا ہوا فاروق، بتاتے کیوں نہیں۔''
''محمود خطرے میں ہے...... اٹھو...... جلدی کرو۔''
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو فاروق...... طاہر احمد نے گھبرا کر کہا۔
عین اسی وقت غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ انہوں نے دیکھا، طاہر کے

والد خاور احمد نہانے کے بعد غسل خانے سے باہر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ
میں تولیہ تھا جس سے وہ اپنے سر کے بال خشک کر رہے تھے:
''ہمیں افسوس ہے انکل...... ہم آج کی پارٹی میں شریک نہیں
ہو سکیں گے...... ابھی ابھی فون آیا ہے، ہمارے بڑے بھائی محمود خطرے میں
ہیں۔ خدا حافظ!'' فاروق نے جلدی جلدی کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر
باہر کی طرف دوڑا، فرزانہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ خاور احمد دونوں کو گھورتے
ہی رہ گئے۔
سڑک پر پہنچ کر انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا...... دُور دُور تک کسی ٹیکسی یا
رکشے کا پتا نہیں تھا...... فرزانہ نے جلدی سے کہا:
''اب کیا کریں فاروق؟''
''دوڑ لگاتے ہیں۔'' فاروق بولا۔
''ٹھیک ہے......'' فرزانہ نے کہا اور دونوں تیزی سے دوڑنے
لگے۔
فرزانہ ہر سال اسکول کے دوڑوں کے مقابلے میں اول آتی تھی اور
فاروق ہاکی کا بہترین کھلاڑی تھا، اس لیے ان کی رفتار بہت تیز تھی، ایک میل کا
فاصلہ انہوں نے تقریباً پانچ منٹ میں طے کر لیا۔ اب وہ گھر کے سامنے تھے
یہاں پہنچ کر، انہوں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔
''کہیں وہ فون کسی نے مذاق میں تو نہیں کیا......'' فرزانہ نے کہا۔
''کیا کہتی ہو...... فون ابا جان کا تھا...... حافظ آباد سے کال تھی۔''
''کیا......!'' فرزانہ دھک سے رہ گئی پھر بولی:
''مگر حافظ آباد میں انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ محمود خطرے میں

ہے۔"

"میں کیسے بتا سکتا ہوں......" فاروق نے جھنجھلا کر کہا۔

"عقل سے کام لے کر......" فرزانہ مسکرائی۔

"اگر تمہاری عقل کام کرتی ہے، تو تم بتا دو......" فاروق نے
بتایا۔

"ابا جان کے جس چچا کی وفات کی خبر ملی تھی، ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی
اپنے گھر میں زندہ ملے ہوں اور اس سے انہوں نے اندازہ لگایا ہو کہ محمود خطرے
میں ہے، کیونکہ گھر میں وہی رہ گیا تھا۔"

"ہوسکتا ہے، تمہارا خیال ٹھیک ہو، لیکن یہ وقت خیالی گھوڑے
دوڑانے کا نہیں ہے......"

"لیکن یہاں تو ہر طرف خیریت نظر آتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"آؤ بھی تو......"

دونوں دروازے پر پہنچے، ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا، دروازہ اندر
سے بند تھا۔ وہ بائیں باغ میں پہنچے۔ بائیں باغ کی کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔
آخر دوبارہ دروازے پر آ کر فاروق نے مخصوص انداز میں گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کے
بجانے کے اس انداز کا محمود کو بخوبی علم تھا لیکن چند منٹ گزرنے پر بھی دروازہ
نہ کھلا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ اندر گڑبڑ ضرور ہے۔" فاروق نے کہا۔

"پھر...... اب کیا کریں؟"

"ہمیں کسی نہ کسی طرح گھر کے اندر پہنچنا ہے۔" فاروق بولا۔

"یہ ہمارا گھر ہے۔ اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اندر جانے کے

صرف دو راستے ہیں، ایک دروازہ، دوسری کھڑکی...... اس کے علاوہ گھر کے
اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں......" فرزانہ نے جواب دیا۔

"اس کے باوجود ہمیں اندر جانا ہے۔" فاروق بولا۔

"تو پھر چلو...... دیوار توڑ کر یا دروازہ توڑ کر اندر چلتے ہیں۔" فرزانہ
نے جل کر کہا۔

"انگارے نہ چباؤ...... منہ جل جائے گا۔ صرف یہ سوچو کہ ہم اندر
کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"تو پھر آؤ...... بائیں باغ کا جائزہ لیتے ہیں...... شاید کسی درخت
سے کام بن جائے۔"

دونوں پھر بائیں باغ میں پہنچے اور ایک ایک درخت کا جائزہ لینے
لگے۔ اس نظریے سے انہوں نے پہلے کبھی درختوں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ ایک
درخت دیوار سے ذرا کم فاصلے پر تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ کوئی اس پر چڑھ کر
چھت پر کود جائے...... اس کے نیچے پہنچ کر انہوں نے اوپر دیکھا۔

"ارے...... یہ کیا ہے؟" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"کہاں......" فاروق نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ دیکھو...... اس درخت سے دیوار تک ایک تار سا کھنچا نظر آ رہا
ہے۔"

فاروق نے غور سے دیکھا۔ تاروں کی روشنی میں اسے ایک باریک
سا تار دکھائی دیا جو منڈیر تک چلا گیا تھا۔

"ہوسکتا ہے، یہ دھاگا ہو...... شاید کسی بچے کی پتنگ کی ڈور ہو۔"

"لیکن مجھے یہ تار دور سے موٹا نظر آتا ہے...... کیوں نہ ہم درخت پر

چڑھ کر اس کا جائزہ لیں۔''

''چلو ٹھیک ہے......''

پہلے فاروق نے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ اس کے پیچھے ہی فرزانہ بھی چڑھنے لگی۔ تینوں درختوں پر چڑھنے کے ماہر تھے، لیکن جو مہارت فاروق کو تھی، وہ ان دونوں میں بھی نہیں تھی۔ اوپر پہنچنے میں فاروق کو صرف ایک منٹ لگا۔ وہ اس تار تک پہنچ گیا تھا۔ اچانک فرزانہ نے اس کی حیرت میں ڈوبی آواز سنی۔

''ارے یہ تو نائیلون کی رسی ہے!۔''

-----☆☆☆-----

ایک اور چال

کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے محمود کو اچھلتے دیکھ کر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ بے رحم مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔ آخر اس نے کہا:

''کیوں! ڈر گئے۔''

''نہیں ڈرا تو نہیں...... چونکا ضرور ہوں۔ مگر سمجھ نہیں سکا...... یہ سب کیا ہے۔'' محمود نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں...... بس اپنا شوق پورا کر رہا ہوں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''شوق...... کیا مطلب...... کیسا شوق؟۔'' محمود نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''میرے شوق عجیب و غریب ہیں۔ بہت جلد تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سب کیا ہے۔''

''بہت اچھا...... اب کیا پروگرام ہے؟۔'' محمود نے لاپروائی ظاہر کرنے کیلئے کندھے اُچکائے، حالانکہ وہ بہت فکر مند تھا، کیونکہ اس کے ابا جان حافظ آباد گئے ہوئے تھے جو صبح سے پہلے واپس نہیں آسکتے تھے۔ فاروق اور

فرزانہ طاہر کی سالگرہ میں گئے ہوئے تھے، وہ بھی رات کے گیارہ بجے سے پہلے
واپس آنے والے نہیں تھے۔ ان حالات میں وہ گھر میں تنہا رہ گیا تھا اور اسے یہ
بھی معلوم نہیں تھا کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص چاہتا کیا ہے۔ یہ سب باتیں اسے
فکر مند کئے دے رہی تھیں۔

''پروگرام...... ہاں...... پروگرام تو بہت زوردار ہے...... ایسا کہ تم
سن کر اچھل پڑو گے۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''میں اچھلنے کی پوری پوری کوشش کروں گا، اگر نہ اچھل سکا تو کوئی
اور پروگرام سنا دیجئے گا۔'' محمود مسکرایا۔

''نہیں تم ضرور اچھلو گے۔''

''اچھا جناب! اچھل لوں گا۔'' محمود نے مسمی صورت بنا کر کہا۔

''چلو...... تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔'' اس نے اس طرح کہا
جیسے گھر کا ہی کوئی فرد ہو۔

''وہاں جا کر کیا کریں گے۔''

''یہ وہاں جا کر ہی بتاؤں گا...... اور یہ بھی بتا دوں گا، اگر کوئی
شرارت کرنے کی تمنا ہے، تو ضرور کرلو، کہیں تمہارے دل میں حسرت نہ رہ
جائے کہ میں نے تمہیں کوئی موقع نہیں دیا۔''

''کیسی شرارت؟'' محمود نے انجان بن کہا۔

''تم سب سمجھتے ہو...... خیر آؤ۔'' وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا قد
لمبا تھا۔ چہرے کا رنگ سرخی مائل سیاہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ چہرہ
بالکل گول تھا۔ البتہ ناک بہت لمبی تھی۔ وہ اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ محمود نے
سوچا، موقع اچھا ہے، خود اس نے اجازت دی ہے، اس لئے ایک کوشش کرکے

دیکھی جائے۔ یہ سوچتے ہی وہ اس کے پیچھے چل پڑا، پھر جونہی وہ کمرے کے
دروازے کے سامنے پہنچے، محمود اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس کی گردن کے ساتھ
لٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں بازو گردن کے گرد کسنے شروع
کر دیے۔

''بہت خوب! تو تم شرارت کر ہی گئے...... میرا خیال تھا، خود میری
دعوت ملنے کے بعد تم اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کرو گے۔'' یہ کہہ کر
وہ تیزی سے گھومنے لگا...... اس کے ساتھ ہی محمود بھی گھوم رہا تھا، اس طرح کہ
اس کی ٹانگیں فرش کے متوازی ہو گئی تھیں۔ اچانک وہ خوفناک آدمی گھومتے
گھومتے رک گیا اور سر کو ایک زوردار جھٹکا مارا...... محمود کے بازو اس کی گردن
سے ہٹ گئے اور وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ بڑی مشکل سے وہ اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل
ہوا۔ پھر بیٹھا ہی رہ گیا، اُٹھ کر کھڑا نہ ہو سکا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جوڑ جوڑ
الگ ہو گیا ہو۔ وہ حیران تھا اسے ہو کیا گیا ہے۔ اس کے بازو اس شخص کی گردن
سے کیوں الگ ہو گئے۔ اس نے جھنجلاہٹ بھری ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ اب
تک کراہ رہا تھا:

''بس...... یا کچھ اور......'' اس نے للکارنے والے انداز میں کہا۔

''جو میں کر سکتا تھا، کر چکا...... آپ نے خود ہی تو اجازت دی تھی۔''
محمود نے برا سا منہ بنایا۔

''ہاں...... یہ ٹھیک ہے...... اب اٹھو اور کمرے میں چلو......''

''لیکن...... لیکن مجھ سے نہیں اُٹھا جا رہا۔'' اس نے کہا۔ لہجے میں بے
بسی تھی۔

''ارے! ابھی تو تم نے میرے اوپر چھلانگ لگائی تھی۔ اور اب تم

سے اُٹھا نہیں جا رہا۔"

"نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"ٹھہرو...... میں تمہیں اُٹھاتا ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر محمود کو سہارا دیا۔ محمود چند قدم چلا اور پھر دھڑام سے گر پڑا۔ وہ بالکل بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر جمشید پاگلوں کی طرح چلا اٹھے۔

"بیگم تم کہاں ہو؟"

جنگل کے سناٹے میں ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔ انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ وہ دوڑتے ہوئے کار کے پاس پہنچے۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ بیگم جمشید اس وقت ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کہیں موجود ہوں، لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس سمت میں آگے بڑھتے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ جنگل میں کہاں اور کس سمت میں ہوں گی اور کس حال میں ہوں گی۔ انہوں نے ایک بار پھر انہیں آواز دی۔ ان کی آواز درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر ناکام لوٹ آئی۔ آخر وہ اندھا دھند ایک طرف بڑھنے لگے۔ وہ ہر جھاڑی اور درخت کے پیچھے دیکھتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اور بھی ان کے بالکل قریب موجود ہو...... کئی بار انہوں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا، لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔

چند منٹ کے اندر اندر انہوں نے سڑک کے آس پاس کا تمام جنگل

دیکھ ڈالا مگر بیگم جمشید کا کہیں نشان نظر نہ آ سکا۔ وہ پھر سڑک کی طرف آئے اور دوسری طرف کے جنگل میں گھس گئے۔ وہ نہتے تھے اور کسی بھی طرف سے دشمن کی گولی آ کر ان کا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ مگر بیگم کی گمشدگی نے انہیں ہر احتیاط سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ اندھا دھند اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی زہریلا کیڑا انہیں کاٹ کھاتا، لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

اس مرتبہ وہ جوش میں کچھ زیادہ دور [illegible] لیکن شاید یہی غلطی تھی، کیونکہ انہوں نے عین اسی وقت کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ پاگلوں کی طرح مڑے اور سڑک کی طرف دوڑے۔ آندھی اور طوفان کی طرح دوڑتے، وہ درختوں اور جھاڑیوں سے خود کو بچاتے وہ سڑک کے کنارے پہنچے تو وہاں کار نہیں تھی۔ چالاک ترین دشمن ان سے ایک اور چال چل گیا تھا۔

-----☆☆☆-----

رسّی پر

نائیلون کی رسی کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ کئی سیکنڈ تک ان دونوں کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ ٹک ٹک رسی کو گھورتے رہے۔ رسی تنی ہوئی تھی۔ اس کا ایک سرا درخت کی ایک شاخ سے بندھا تھا اور دوسرا سرا منڈیر کے پیچھے غائب تھا......

''لیکن یہاں اس رسی کا کیا کام۔'' آخر فرزانہ نے کہا۔

''پوچھو رسی سے...... مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔'' فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

''یہ وقت مذاق کا نہیں ہے۔''

''ہاں...... یہ تو درخت پر چڑھنے اور پھر اس رسی کے ذریعے چھت پر پہنچنے کا وقت ہے۔'' اس نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے، شاباش...... جلدی کرو...... اس رسی پر لٹکتے ہوئے منڈیر پر پہنچ جاؤ میں بھی تمہارے پیچھے آتی ہوں۔'' فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

''اور رسی میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تو میرے پیچھے آنا نہ بھولنا۔''

فاروق بری طرح جھلایا ہوا تھا۔

''فکر نہ کرو...... تم چلو تو سہی۔''

آخر فاروق شاخ سے اتر کر رسی کے ساتھ لٹکنے لگا اب وہ دونوں بازوؤں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے وزن کی وجہ سے رسی درمیان میں سے نیچی ہو گئی تھی اور چونکہ نائیلون کی تھی، اس کی وجہ سے ہاتھ پھسل پھسل جا رہے تھے۔ فاروق کو یہ کام بہت مشکل لگا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اس سے تو پانی کے پائپ پر چڑھنا آسان ہے۔

پانچ منٹ بعد وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور منڈیر اس سے چند ہاتھ آگے تھی۔ فرزانہ سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس طریقے سے منڈیر تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے فاروق منڈیر پر پہنچ گیا۔ اس نے سانس درست کرتے ہوئے دبی آواز میں کہا:

''فرزانہ تم وہیں رہو۔ تمہارے لئے یہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہوگا۔''

''مگر میں یہاں رہ کر کیا کروں گی...... نہیں...... میں تمہارے ساتھ نیچے چلوں گی...... نہ جانے محمود پر کیا گزری، اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا کہ دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی کوئی جواب نہیں۔''

''اچھا تو پھر آؤ۔''

فرزانہ بسم اللہ پڑھ کر رسی کے ساتھ لٹک گئی۔ اس قسم کا موقع اس کی زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔ درختوں اور پانی کے پائپوں پر چڑھنے کا اتفاق تو اکثر ہوا تھا۔ رسی پر لٹکتے ہوئے اس نے ایک نظر نیچے ڈالی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کافی اونچائی پر تھی۔ ایسے میں اگر رسی اس کے ہاتھوں سے نکل جاتی تو شاید چوٹ یقینی تھی، کیونکہ درمیان میں درخت کی شاخیں تھیں وہ ان میں الجھتے

ہوئے نیچے گرتی۔

"نیچے نہ دیکھو......" فاروق نے اسے منع کیا اور اس نے
اوپر کر لیا۔ وہ ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھنے لگی۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا
جیسے رسی درخت کی شاخ پر سے کھسک رہی ہو۔ اس نے گھبرا کر درخت کی طرف
دیکھا۔ شاید رسی کی گرہ ڈھیلی ہو گئی تھی اور وہ اس کی جگہ سے کھسک کر آگے بڑھ
رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فرزانہ نیچے جھکنے لگی۔

"ارے...... یہ کیا ہوا......"

"رسی درخت کی شاخ سے آگے کھسک رہی ہے۔" اس نے بوکھلا کر
کہا۔

"اوہ...... اگر گرہ کہیں اٹک نہ گئی تو کیا ہوگا۔" فاروق کو یوں لگا جیسے
اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" فرزانہ مسکرائی۔

اسی وقت رسی کا کھسکنا بند ہو گیا۔ اس کی گرہ شاید کسی گانٹھ کی وجہ سے
رک گئی تھی، لیکن اب فرزانہ اتنا نیچے جھک گئی تھی کہ اس کے لئے رسی کے ذریعے
چھت کی طرف بڑھنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر رسی کو اوپر سے
پکڑتی مگر چکنی رسی پر سے ہاتھ پھسل کر پھر وہیں آجاتا اور اس طرح پورے تین
منٹ کی بھرپور کوشش کے بعد بھی فرزانہ اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھ سکی۔
فاروق کا مارے گھبراہٹ کے بُرا حال تھا۔ اس نے کہا:

"ٹھہرو فرزانہ...... میں تمہیں کھینچتا ہوں۔" اس نے رسی کی طرف
ہاتھ بڑھایا۔ یہ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ منڈیر والے سرے پر لوہے کا ایک
آنکڑہ بندھا ہوا تھا اور یہ منڈیر سے چمٹا ہوا تھا۔ آنکڑے کی طرف سے کوئی خطرہ

نہیں تھا۔

"نہیں فاروق...... ایسا نہ ہو کہ مجھے کھینچتے کھینچتے تم نیچے آ رہو......" فرزانہ نے کہا۔

"اللہ مالک ہے...... اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔"

"تم میری فکر نہ کرو...... نیچے جا کر محمود کی خبر لو......" فرزانہ جھلا اٹھی۔

"نہیں...... میں تمہیں اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ محمود کے
ساتھ تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو بھی چکا ہوگا، لیکن تم اس طرح کب تک لٹکی رہو گی۔"

یہ کہہ کر فاروق نے رسی کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اسے اوپر
کھینچنے لگا۔ فرزانہ کافی وزنی تھی۔ فاروق کو پیر جما کر پورا زور لگانا پڑا۔ اگر اس
کے پیر اکھڑ جاتے تو وہ سیدھا نیچے جا گرتا۔

اور پھر رسی سیدھی ہو گئی۔ فاروق نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"آؤ فرزانہ...... جلدی کرو...... رسی اب بالکل سیدھی ہے۔ میں نے
اسے پکڑ رکھا ہے۔"

فرزانہ پھر ایک ایک ہاتھ کر کے آگے بڑھنے لگی۔ آخر اس کا دایاں
ہاتھ فاروق کے ہاتھ تک پہنچ گیا۔ فاروق نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام
لیا۔ اب فرزانہ نے دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ فاروق نے رسی چھوڑ دی اور
فرزانہ کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اب وہ اسی کے ہاتھوں میں لٹک رہی تھی۔
دونوں کا سانس بُری طرح پھول گیا تھا۔ وہ ہانپ رہے تھے۔

"ہمت کرو فرزانہ...... میں تمہیں اوپر کھینچتا ہوں......"

"شکریہ فاروق......" فرزانہ نے غمزدہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

فاروق نے اپنی پوری طاقت بازوؤں میں سمیٹ لی اور فرزانہ کو او

اٹھانے لگا۔ پھر جونہی فرزانہ کے ہاتھ منڈیر تک پہنچے، اس نے اس کا [illegible]
چھوڑ دیا۔ فرزانہ نے اس سے منڈیر تھام لی۔ اب مسئلہ آسان تھا۔ دوسرے ہی
لمحے وہ اپنی چھت پر کھڑے ہانپ رہے تھے۔

''اگر اس وقت محمود خطرے میں نہ ہوتا تو ہم چھت پر لیٹ کر اپنے
سانس درست کرتے۔'' فرزانہ نے کہا۔

''تم لیٹ جاؤ...... میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔''

''نہیں فاروق...... ہم دونوں ساتھ ہی جائیں گے...... آؤ چلیں۔''

دونوں لڑکھڑاتے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگے۔ صحن میں انہیں
کوئی نظر نہ آیا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کسی گڑبڑ کے آثار نہیں تھے۔
دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر فاروق اپنے کمرے کی طرف
مڑ گیا۔ فرزانہ اس کے پیچھے تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

انہوں نے آؤ نہ دیکھا نہ تاؤ، اندر گھس گئے اور پھر بڑی زور سے
اچھلے۔ محمود اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ زرد تھا دونوں
تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

''محمود...... محمود...... تمہیں کیا ہوا؟'' فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

فاروق نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ فرزانہ نے دل کی دھڑکنیں
سننے کے لیے اس کے سینے پر کان رکھ دیا۔

''یہ صرف بے ہوش ہوا ہے...... فکر نہ کرو۔''

ایک کھنک دار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ دونوں گھبرا کر
مڑے، لیکن مڑنے کے ساتھ ہی وہ دھڑام سے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

☆☆☆

انسپکٹر جمشید ہونقوں کی طرح سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ سو میل
کے فاصلے میں سے ابھی صرف پچاس میل طے ہوئے تھے۔ یعنی ابھی وہ گھر سے
پچاس میل دُور تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں۔ کار بھی شہر کی طرف ہی
لے جائی گئی تھی۔ وہ پیدل چلتے ہوئے بھی گھر جا سکتے تھے لیکن اس طرح بہت دیر
ہو جاتی۔ جب کہ وہ فوراً وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کا جی چاہا...... کاش کوئی کار
ہی اس طرف آ جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حافظ آباد کی طرف سے ایک گاڑی
کی روشنیاں دکھائی دیں۔ ان کا دل خوشی سے کھل اُٹھا۔ پھر اچانک انہیں بیگم
جمشید کا خیال آیا...... بھلا وہ بیگم کو جنگل میں دشمنوں کے قبضے میں چھوڑ کر کس طرح
جا سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دشمن انہیں کار پر تو بٹھا کر لے نہیں گیا ہو گا جس کا
مطلب یہ تھا کہ دشمن ایک سے زیادہ تھے۔ ان میں سے ایک نے بیگم جمشید کو
سڑک سے ہٹایا اور جب وہ جنگل میں انہیں تلاش کرتے ہوئے دُور نکل گئے تو
دوسرا کار لے بھاگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم ابھی یہیں کہیں تھیں۔ دشمن اس
وقت بھی شاید ایک سے زیادہ تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا...... میں
اس جنگل کو چھانے بغیر گھر نہیں جاؤں گا...... دیکھا جائے گا۔ پھر قریب آتی ہوئی
کار کو دیکھ کر انہیں ایک اور تدبیر سوجھی۔ انہوں نے کار والے کو کار روکنے کے
لیے اشارہ دیا...... کار ان کے قریب آ کر رُک گئی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک
نوجوان آدمی بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کار میں اور کوئی نہیں تھا۔

''کیا آپ میری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں...... آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟'' اس نے خوش
اخلاقی سے کہا۔

"مجھے جانا تو کہیں نہیں...... صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ میرا ایک فون کر دیں۔ میں فون نمبر اور پیغام لکھے دیتا ہوں۔"

"بہت اچھا...... مگر آپ یہاں جنگل میں کیا کر رہے تھے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے...... چند روز بعد اخبار میں پڑھ لیجئے گا۔"

"بہت خوب...... تو آپ کسی اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ بات نہیں......" انہوں نے یہ کہتے ہوئے جیب سے کاغذ اور قلم نکال لیا۔ کار والا بھی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

انسپکٹر جمشید کاغذ پر نمبر اور پیغام لکھنے لگے۔ دراصل انہوں نے یہ سوچا تھا کہ اکرام کو اطلاع کر دی جائے۔ وہ خود ہی جا کر معاملات سنبھال لے گا۔ اور وہ یہاں بیگم کی تلاش کا کام جاری رکھیں گے۔ ویسے ابھی تک ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ سب چکر کیا ہے...... کون اس چکر کو چلا رہا ہے اور کیوں...... صرف ایک بات اس وقت تک ثابت ہوئی تھی...... وہ یہ کہ وہ جو کوئی بھی تھا...... بہت چالاک تھا۔ بہت ہی زیادہ۔

انہوں نے کاغذ کا پرزہ نوجوان کی طرف بڑھا دیا...... اس وقت انہوں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا لگا۔

"میں نے شاید آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" انہوں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے......"

"آپ کا نام کیا ہے؟"۔

"مجھے ابرار بیگ کہتے ہیں...... کہیے...... کچھ یاد آیا آپ کو......" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں...... لیکن میرا ذہن بار بار مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ آپ کو اس سے پہلے کہیں دیکھا ضرور ہے...... خیر دیر نہ کیجئے...... یہ پیغام بہت ضروری ہے۔"

"ارے مجھے یاد آ گیا...... آپ انسپکٹر جمشید تو نہیں......"

"آپ نے ٹھیک سمجھا...... لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک یاد نہیں کر سکا۔" انہوں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں...... میں آپ کو یاد دلاتا ہوں......"

یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا...... اس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں نیلے رنگ کا کاغذ تھا۔ اس نے کاغذ کی تہہ کھول کر ان کے چہرے کے سامنے کر دی۔

"اس کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ دیکھ کر آپ کو سب کچھ یاد آ جائے گا۔"

انسپکٹر جمشید نے کاغذ کو گھور کر دیکھا...... اس پر سرے سے کوئی الفاظ نہیں تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتے...... ان کا سر زور سے چکرایا اور وہ دھڑام سے سڑک پر گر پڑے۔

نوجوان انہیں گرتے دیکھ کر مسکرایا...... پھر اس نے زور سے تالی بجائی۔ فوراً ہی جنگل میں ایک طرف کی جھاڑیوں میں حرکت ہوئی اور تین سائے کار کی طرف بڑھنے لگے۔ ان میں سے ایک نے زور سے پوچھا

"کیا کام ہو گیا؟"

"ہاں ...... انسپکٹر جمشید ہمارے سامنے بے ہوش ہو چکے ہیں۔"

"بہت خوب ...... ! ہمارا پورا منصوبہ بالکل ہماری مرضی کے مطابق مکمل ہو گیا ...... اب صرف ایک کام رہتا ہے، ان سب کو وہاں پہنچانا۔"

"ہاں ...... وہاں ...... جہاں سے آج تک کوئی دوبارہ واپس نہیں آیا۔" نوجوان نے مسکرا کر کہا اور وہ انسپکٹر جمشید پر جھک گیا۔

-----☆☆☆-----

تین قیدی

محمود کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ وہ ایک پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ پلنگ کے پاس ایک میز اور ایک کرسی بھی موجود تھی۔ میز پر ٹیلی فون رکھا تھا۔

وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے سب کچھ ایک دم یاد آنے لگا تھا۔ اس نے حملہ آور پر پیچھے سے حملہ کر دیا تھا، لیکن حملہ آور نے چکر کھاتے ہوئے اسے دیوار کے ساتھ دے مارا تھا۔ پھر اس نے خود ہی محمود کو اُٹھایا تھا، لیکن چند قدم چلنے کے بعد ہی وہ دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ پہلا سوال جو اس کے ذہن میں آیا، وہ یہ تھا کہ آخر میں بے ہوش کیوں ہو گیا تھا۔ چوٹ اتنی نہیں آئی تھی کہ بے ہوش ہو جاتا۔ اچانک اسے یاد آیا، بے ہوش ہونے سے پہلے اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

یہ سب باتیں یاد آتے ہی اس نے کمرے کو گھور کر دیکھا۔ یہ کمرہ ان کا تو نہیں تھا۔ تو ...... پھر ...... وہ کہاں تھا ...... اس کا سر گھوم گیا ...... پھر خود پر قابو پا کر دروازے کی طرف بھاگا ...... ایک جھٹکے سے دروازے کو کھولنا چاہا، لیکن دروازہ تو باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ وہ مڑا اور فون کے قریب پہنچا۔ اس نے ریسیور اٹھا

کر نمبر ڈائل کرنے چاہے، لیکن معلوم ہوا کہ فون ڈیڈ تھا۔ وہ اس فون سے کسی کے نمبر ڈائل نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے زور زور سے کریڈل پر ہاتھ مارا، دوسری طرف سے فوراً جواب ملا:

"کیا بات ہے...... کیوں پریشان ہو رہے ہو۔"

"میں کہاں ہوں......"

"میرے گھر میں......" جواب ملا۔

"آپ...... آپ وہی تو نہیں جو مجھے اپنے گھر میں نظر آئے تھے۔"

"ہاں! میں وہی ہوں۔"

"مجھے یہاں کیوں بند کیا گیا ہے۔" محمود نے بوکھلا کر پوچھا۔

"بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

"ابھی بتا دینے میں کیا حرج ہے۔" محمود نے بے چین آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ کمرے میں گھومو، پھرو، آرام کرو...... کچھ کھانے پینے کو جی چاہے تو فون پر کہہ دو...... یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"لیکن آخر مجھے یہاں رکھا کس لئے گیا ہے۔"

"میں نے کہا نا، بہت جلد پتا چل جائے گا۔"

"آپ غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ اس طرح کسی کو قید رکھنا جرم ہے۔ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، قانون آپ تک پہنچ جائے گا۔"

"ایسی باتیں نہ سوچو...... میرے ہاتھ قانون سے بھی لمبے ہیں۔ اگر میں خود تمہیں اپنی شکل نہ دکھاتا تو قیامت تک تمہیں بھی معلوم نہ ہوتا۔"

"تو پھر تم نے مجھے اپنی صورت کیوں دکھائی؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس یونہی...... اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اب تم کبھی واپس نہیں جا سکو گے۔"

"کیا مطلب؟" محمود بڑے زور سے اچھلا۔

"ہاں! مجھے افسوس ہے کہ اب تم کبھی اپنے گھر واپس نہیں جا سکو گے، تاہم میں آخری وقت سے پہلے تمہیں تمہارے والد اور بھائی بہن کی شکل ضرور دکھا دوں گا، لیکن تم ان سے کوئی بات نہیں کر سکو گے۔"

"آخری وقت...... آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"آخری وقت سے مراد آخری وقت ہی ہوتی ہے۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

"خیر دیکھا جائے گا، تمہارا آخری وقت آتا ہے یا میرا...... ویسے تم مجھے ان کی شکل کس طرح دکھاؤ گے۔"

"وہ بھی میرے مہمان ہیں......"

"کیا!!!" محمود پوری قوت سے چلایا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان میں بے پناہ خوف سمٹ آیا۔

☆☆☆

فاروق فرزانہ میں سے پہلے فرزانہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبرا کر پلکیں جھپکیں...... اس کے ساتھ ہی فرش پر فاروق بے سدھ پڑا تھا۔ اس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا:

"اُٹھو فاروق...... اُٹھو۔"

''سونے دو...... کیا کرتی ہو...... میں اس وقت ایک بہت خوبصورت خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرا گھوڑا اس وقت بادلوں کے پار اڑ رہا ہے۔'' فاروق نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''اگر تم فوراً جاگ نہ گئے تو سچ مچ بادلوں کے پار پہنچ جاؤ گے۔'' فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

''تو کیا ہوا...... یہ تو اور بھی اچھا ہوگا...... میں بادلوں کے پار والے دیس میں چہل قدمی کیا کروں گا۔'' فاروق نے بدستور آنکھیں بند کیے جواب دیا۔

''میں کہتی ہوں، اُٹھو۔''

''میں کہتا ہوں، سونے دو۔'' فاروق جھنجلا کر کہا۔

''اگر نہ اُٹھے تو پانی کی بالٹی اُلٹ دوں گی۔'' فرزانہ نے دھمکی دی، حالانکہ کمرے میں بالٹی اور پانی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔

''ارے باپ رے۔ ٹھہرو...... ابھی اُٹھتا ہوں...... پانی نہ انڈیلنا۔ ابھی میرا نہانے کا پروگرام نہیں ہے۔'' فاروق نے کہا اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر آنکھیں مل مل کر کمرے کو دیکھنے لگا۔

''میں...... یہ ہم کہاں ہیں۔''

''فرش پر......'' فرزانہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں...... لیکن یہ فرش کہاں ہے۔''

''اس کمرے میں ہے۔'' فرزانہ بولی۔

''بہت خوب...... یہ ہوا نا جواب...... مطلب یہ ہوا کہ یہ ہمارا کمرہ نہیں ہے۔ ورنہ میں مسہری پر ہوتا۔''

''بہت جلدی سمجھ گئے۔'' فرزانہ نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''مرچیں کیوں چبا رہی ہو، کیا کھانے کو کچھ نہیں ملا۔''

''بے وقوف...... ہم کسی کی قید میں ہیں...... یاد کرو...... ہم نائیلون کی رسی کے ذریعے اپنے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے کمرے میں محمود بیہوش پڑا تھا۔ ہم اس پر جھکے ہی تھے کہ ایک آواز سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔'' فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

''یاد آ گیا...... لیکن ہم بے ہوش کیوں ہوئے تھے۔''

''مجھے کیا پتا......'' فرزانہ نے اسے گھورا۔

''سوال یہ ہے کہ محمود کہاں ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''خدا جانے ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں۔''

''ارے...... یہاں تو فون بھی رکھا ہے...... آؤ ابا جان کو فون کریں۔'' فاروق کی نظر جونہی میز پر رکھے فون پر پڑی، وہ خوش ہو گیا۔

''کیا ہمیں یہاں تک لے آنے والا اس قدر بے وقوف ہے کہ اس نے فون ڈائل کرنے کے قابل رہنے دیا ہوگا۔'' فرزانہ نے مایوس ہو کر کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو...... لیکن، اس فون پر شاید ہم اس سے بات کر سکیں۔''

''تو ٹھیک ہے...... کر لو...... میں تو اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''

''تمہارا کیا ہے...... تم تو کسی بھی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔'' فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور فون کی طرف بڑھا...... اس نے دیکھا، فون

ڈیڈ تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور کریڈل کو بار بار دبانے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے تم جاگ گئے ہو۔"

"معلوم ہونے والی کون سی بات ہے...... تم جو کوئی بھی ہو، ہمارے لئے ناشتے کا بندوبست کرو کیونکہ ہم نے رات سے کچھ نہیں کھایا، پارٹی میں سے بھی ہم خالی پیٹ ہی بھاگ آئے تھے۔"

"عجیب بات ہے، تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کہاں ہو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"جب بھوک زوروں کی لگی ہو تو سب سے پہلے کھانے پینے کا خیال آتا ہے۔ جب پیٹ بھر جائے گا تو پھر پوچھیں گے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں ناشتہ ضرور ملے گا، لیکن ابھی ناشتے کا وقت نہیں ہوا...... یہاں ہر کام وقت پر ہوتا ہے۔"

"تو پھر اسوقت کس کام کا وقت ہے۔ ہمیں بتادو...... ہم وہی کام شروع کر دیتے ہیں۔"

"تم تو مہمان ہو...... وہ بھی چند دنوں کے...... اس لئے تم سے کام لینا...... مہمانوں سے کام لینا کوئی اچھی بات تو نہیں......" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اور دوسروں کو کمروں میں بند رکھنا اچھی بات ہے۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"نہیں تو...... تم دونوں کمرے میں بند تو نہیں ہو...... تم چاہو تو کمرے سے نکل کر برآمدے میں بھی آسکتے ہو۔ لیکن برآمدے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ

کرنا، ہر طرف بجلی کا کرنٹ دوڑ رہا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ تو پھر ناشتے سے پہلے ہم چہل قدمی کر لیں۔"

"ہاں...... ہاں...... ضرور......"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم چاہتے کیا ہو۔"

"بہت جلد تمہیں بتا دیا جائے گا۔"

"کیا ہمارے ابا جان کو ہمارے بارے میں معلوم ہے۔" فاروق نے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"کیا معلوم ہو جائے گا۔" فاروق نے ایک دم پوچھا۔

"یہی کہ تم لوگ غائب ہو۔"

"اور محمود کہاں ہے؟"

"وہ بھی یہیں ہے...... تمہارے بالکل قریب...... کمرے سے نکل کر تم اسے دیکھ سکتے ہو۔"

"ارے!" وہ اچھل پڑا...... ریسیور کریڈل میں پٹختے ہوئے اس نے فرزانہ سے کہا۔

"فرزانہ! محمود بھی یہیں ہے...... آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں دروازے کی طرف جھپٹے...... واقعی دروازہ کھلا تھا۔

-----☆☆☆-----

کار والا

سورج کی تیز کرنیں اب انسپکٹر جمشید کے جسم میں چبھنے لگیں تو ان کی
آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ انہوں نے دیکھا، وہ ابھی تک اسی جگہ تھے
جہاں رات کو کار والے کے پاس کھڑے تھے۔ کار والے سے باتیں کرتے
کرتے وہ دھڑام سے گرے تھے اور بے ہوش ہو گئے تھے۔

"آخر میں بے ہوش کیسے ہو گیا تھا۔" انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔
پھر اچانک انہیں بیگم جمشید کا خیال آ گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح جنگل میں دوڑنے
لگے۔ اب رات کا وقت نہیں تھا کہ انہیں درختوں کو چھاننے میں کوئی دقت ہوتی۔
وہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔

پھر اچانک ان کے قدم ایک دم رُک گئے۔ ایک جھاڑی میں انہیں
م کا دوپٹہ نظر آ گیا تھا۔ آسمانی رنگ کا دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اگر جھاڑی میں
ا ہوا نہ ہوتا تو نہ جانے اس وقت تک کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہوتا۔ وہ تیزی سے
رف بڑھے۔ دوپٹہ انہوں نے جھاڑی سے چھڑا کر ہاتھ میں لے لیا اور
ھر نظریں دوڑانے لگے۔

زمین پر قدموں کے کچھ نشان نظر آئے۔ وہ ان نشانات کے ذریعے

آگے بڑھتے گئے۔ قدموں کے نشانات دو آدمیوں کے تھے، لیکن یہ دونوں
مردانہ جوتوں کے نشان تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم جمشید کو بھی وہ لوگ
ڈرک پر بیہوش کرنے کے بعد لے گئے تھے، ورنہ ان کے قدموں کے نشانات
بھی وہاں ہوتے۔

نشانات انہیں ایک کھڈ میں لے گئے۔ یہ تین فٹ گہری اور تقریباً
سات آٹھ فٹ لمبی کھڈ تھی۔ بیگم جمشید اس میں اوندھے منہ پڑی تھیں۔
انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ پھر
ایک ہی چھلانگ انہیں بیگم جمشید کے قریب لے گئی۔ انہوں نے جلدی سے بیگم کو
سیدھا کیا اور یہ دیکھ کر اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا کہ بیگم صرف بے ہوش تھیں۔
ان کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ انہوں نے انہیں ہوش میں لانے کے لئے
جھنجھوڑا، آوازیں دیں، تب کہیں جا کر ان کی آنکھیں کھلیں۔

"ارے میں کہاں ہوں......"

"ہم اس وقت اسی جنگل میں ہیں بیگم...... جس میں رسا بندھا ہوا
دیکھ کر رُک گئے تھے۔"

"اوہ! مجھے کیا ہوا تھا؟"

"دشمنوں نے شاید تمہیں بے ہوش کر دیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد آ گیا...... آپ رسا کھولنے کے لئے درخت کی طرف
گئے ہی تھے کہ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آوازیں سنیں، میں گھبرا کر پلٹی، اسی
وقت کسی نے میری ناک پر رومال رکھ دیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔"

"اوہ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی کوئی مدد نہ

کر سکے۔"

"اللہ محافظ ہے...... کیا تم اُٹھ چل سکتی ہو...... کم از کم سڑک کے
کنارے تک...... ہم وہاں کسی کار وغیرہ کا انتظار کریں گے۔"

"ہاں میں چل سکتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ انسپکٹر جمشید انہیں سہارا دیتے ہوئے سڑک
کے کنارے تک لائے اور زمین میں گڑے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

یہ سڑک آمد و رفت کے لئے بہت کم استعمال ہوتی تھی۔ حافظ آباد
ایک چھوٹا گاؤں تھا اور گاؤں سے شہر آنے جانے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔
اس لئے سڑک زیادہ تر سنسان پڑی رہتی۔ ایک دوسری سڑک بھی تھی، وہ بہت
لمبی تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بچوں کو کوئی خطرہ پیش ہی نہ آیا ہو۔" بیگم
جمشید نے کچھ دیر بعد کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... اگر انہوں نے مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی
کوشش کی ہوتی تو میں سوچ لیتا کہ بچوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن حالات یہ
ہیں کہ ہمیں پہلے افتخار چچا کی وفات کی خبر ملی ہے۔ دوسری طرف فاروق اور
فرزانہ کا اپنے دوست طاہر کے گھر جانے کا پہلے ہی پروگرام بن چکا ہے۔ گھر میں
صرف محمود ہے۔ ایسے میں اس کے سوا کیا سوچا جا سکتا ہے کہ خطرہ محمود کے سر پر
منڈلا رہا تھا۔ ہمارے راستے میں رسّا باندھنے کا مطلب بھی یہی نظر آتا ہے کہ
ہم رات سے پہلے واپس گھر نہ پہنچ سکیں...... تاکہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں
کر لیں۔"

"اوہ! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں یہاں اسی لئے الجھایا گیا

ہوں گے۔"

"ہاں...... اب خدا جانے وہاں کیا حالات ہوں گے۔"

"دیکھئے...... ایک کار حافظ آباد کی طرف سے آ رہی ہے۔" اچانک
بیگم جمشید نے کہا۔

"بہر ٹھیک، یہ بھی مجرموں کی کار نہ ہو۔"

"دیکھا جائے گا......"

"اچھا میں اسے روکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے،
سڑک پر آئے اور ہاتھ کے اشارے سے کار والے کو رکنے کا اشارہ کیا۔
پھر جونہی کار نزدیک آئی۔ وہ بڑے زور سے اُچھلے۔

☆☆☆

فاروق اور فرزانہ کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ ساتھ
ہی انہیں ایک اور کمرہ بھی نظر آیا جس کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کے دائیں
بائیں دو کھڑکیاں تھیں جن میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے ایک کھڑکی کی
طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ کمرے کے اندر محمود ایک
کرسی پر بیٹھا تھا۔

"محمود!" فاروق چلّا اُٹھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ محمود اس طرح بیٹھا تھا جیسے
فاروق کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے بے تابی کے عالم میں
کھڑکی کے شیشے پر زور زور سے ہاتھ مارے، لیکن اس پر بھی محمود کے کان پر جوں

تک نہ رینگی۔

"یہ کیا بات ہے فاروق...... کیا محمود بہرہ ہو چکا ہے۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"خدا جانے کیا بات ہے...... ٹھہرو...... میں ایک تجربہ کرتا ہوں۔ تم ذرا واپس اپنے والے کمرے میں جاؤ...... میں باہر سے تمہیں آواز دوں گا۔"

"اچھا" فرزانہ نے کہا۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

فاروق نے دروازہ بند کر دیا۔ اور کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شیشے سے فرزانہ صاف نظر آئی۔ اس نے فرزانہ کو آواز دی، لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ مسکرا اُٹھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور فرزانہ سے کہا:

"باہر آ جاؤ فرزانہ......"

"کیا ہوا......" اس نے پوچھا۔

"میں اندر سے تمہیں نظر آ رہا تھا یا نہیں۔"

نہیں...... نہ جانے یہ کیسے شیشے ہیں۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"میں حیران ہوں...... ان شیشوں کے ذریعے اندر کی چیز باہر سے صاف نظر آ سکتی ہے، لیکن اندر سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اور یہ کمرے ساؤنڈ پروف بھی ہیں۔"

"اور اسی لئے محمود ہمیں نہیں دیکھ سکا اور نہ ہماری آواز سن سکا۔"

"تو پھر کیوں نہ دروازہ کھول کر اندر جانے کی کوشش کریں۔"

"ہاں آؤ۔"

انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہ ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ دروازے میں تالا لگایا جا چکا ہے۔ تالے

کے لئے کوئی سوراخ بھی نہیں بنا ہوا تھا، البتہ ایک طرف کچھ بٹن لگے ہوئے تھے اور ان بٹنوں میں ایک سے نو تک نمبر لکھے ہوئے تھے۔

"دروازہ شاید ان میں سے کچھ بٹنوں کو دبا کر کھلتا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں ہمارے کمرے کے دروازے پر بھی ایسے ہی نمبر لگے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نہ محمود سے مل سکتے ہیں، نہ اس سے باتیں کر سکتے ہیں، بس اسے دیکھ سکتے ہیں۔"

"ہاں! لیکن آخر اس سارے جھنجھٹ کا مطلب کیا ہے۔"

"مطلب ہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"آؤ پورا برآمدہ دیکھیں۔"

دونوں برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گئے۔ دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ تمام کمرے ایک جیسے تھے۔ صرف ان کے کمروں کے علاوہ انہیں کسی اور کمرے میں کوئی انسان نظر نہیں آیا۔

"کم از کم ایک بات ہمارے اطمینان کے لئے کافی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اور وہ کیا......"

"وہ یہ کہ ابا جان آزاد ہیں۔ وہ ضرور سُراغ لگاتے ہوئے ہم تک پہنچ جائیں گے۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا...... حالات عجیب و غریب ہیں۔ نہ جانے ہم شہر کے کس حصے میں ہیں، اپنے ہی حصے میں ہیں یا کسی دوسرے شہر میں۔" فاروق کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''فاروق ۔۔۔۔ مایوسی گناہ ہے ۔۔۔۔ حوصلہ نہ ہارو۔''

''بے فکر رہو ۔۔۔۔ میں کسی حالت میں حوصلہ نہیں ہارتا۔''

''مجھے بہت بھوک لگی ہے ۔۔۔۔ اب کیا کریں۔''

''آؤ اپنے کمرے میں چل کر اسے کھانے کے لیے کہیں۔'' فاروق نے کہا۔

دونوں اپنے کمرے میں داخل ہوئے اور چونک اٹھے، کمرے میں میز پر کھانے کی ٹرے رکھی تھی۔ دونوں اس پر ٹوٹ پڑے

کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر برآمدے میں جانے کے لیے دروازے کی طرف آئے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔

''اب شاید وہ محمود کو برآمدے میں گھومنے کی اجازت دے گا۔ اور محمود ہمیں باہر کھڑا ہو کر دیکھے گا، ہمیں آوازیں دے گا، لیکن ہم اس کی آواز نہ سن سکیں گے، نہ شکل دیکھ سکیں گے۔''

''اوہ! آخر وہ چاہتا کیا ہے؟'' فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

''ہمیں بے بسی کے احساس میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے، ہم اس کے سامنے بالکل بے حقیقت ہو جائیں۔ وہ ہم سے بلی چوہے والا کھیل کھیل رہا ہے۔''

''اوہ! تو ہم اس کی نظر میں چوہے ہیں۔''

''ہاں! ۔۔۔۔'' فاروق نے عجیب انداز میں کہا اور پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

اس کا قہقہہ لمبا ہوتا چلا گیا ۔۔۔۔ اتنا لمبا کہ فرزانہ گھبرا گئی۔ اس نے

خوفناک منصوبہ

کار میں بیٹھے ہوئے شخص کی نظر جونہی سڑک پر کھڑے انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید پر پڑی، اس کی آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''انسپکٹر جمشید...... یہ آپ ہیں۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں! پروفیسر صاحب...... مگر آپ یہاں کہاں!''

انسپکٹر جمشید کا بھی حیرت کے مارے بُرا حال تھا۔ پروفیسر ریاض ملک کا مشہور سائنس دان تھا۔ پروفیسر داؤد کے دوستوں میں سے تھا۔ اور کئی تقریبات میں انسپکٹر جمشید اور ان کے بچوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ملک کے لئے اس نے کئی مفید ایجادات بھی کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے جنگل میں سے گزرتے دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔

''میں حافظ آباد سے آگے اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے بیمار ہے۔ واپسی پر میں نے اس سڑک کے ذریعے آنے کا پروگرام بنا لیا...... کیونکہ مجھے ہرے بھرے درختوں سے بہت لگاؤ ہے۔ میں لہلہاتے کھیت دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں، مگر یہ تو بتائیں، آپ دونوں یہاں کیسے پہنچ گئے۔'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

...ر آپ پلٹ دیا...

...ایک لمبی کہانی ہے...... ہمیں شہر جانا ہے

''ارے ارے...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ پروفیسر داؤد کے ...ہیں۔ میں بھی پروفیسر کا دوست ہوں۔ اس طرح آپ بھی میرے ...ہوئے۔ اگر دوستی کا یہ رشتہ نہ بھی ہوتا تو عام راہگیروں کی حیثیت میں بھی ...دونوں کو لفٹ ضرور دیتا، کیونکہ یہ اخلاقی فرض ہے...... ویسے میں اب ...حیران ہوں کہ آپ یہاں کس طرح موجود ہیں۔ نہ کوئی سواری...... اور نہ کوئی سامان!''

''میں نے عرض کیا نا...... یہ ایک لمبی کہانی ہے...... راستے میں بتاؤں گا۔''

''آئیے پھر......''

پروفیسر ریاض نے کہا اور انسپکٹر جمشید ان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بیگم جمشید نے پچھلی سیٹ کا رُخ کیا۔ پروفیسر ایک لمبے چوڑے آدمی تھے۔ ان کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ چہرہ بھی گولائی لئے ہوئے تھا۔ ناک ذرا چھوٹی تھی۔

سفر کے دوران انسپکٹر جمشید نے انہیں تفصیل سے ساری کہانی سنائی۔ پروفیسر ریاض یہ کہانی سن کر دنگ رہ گئے۔ انہوں نے کہا:

''آپ کا مطلب یہ ہوا کہ اس مرتبہ مجرم نے آپ کو خوب نچایا ہے۔''

''جی ہاں! وہ بہت چالاک ہے...... ذہن سے کام لینے کا ماہر ہے۔ وہ ہاتھ پاؤں سے لڑنے کے بجائے دماغ سے لڑتا ہے۔ اس کی چالیں

اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب وہ کام دکھا جاتا ہے۔ میں نے آج تک اتنے تیز طرار ذہن کا مجرم نہیں دیکھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ ابھی تک سامنے پردے میں چھپا بیٹھا ہے، میرے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔''

''پھر اب آپ کیا کریں گے؟'' پروفیسر ریاض نے پوچھا۔

''سب سے پہلے گھر جا کر حالات کا جائزہ لوں گا۔ اس کے بعد کوئی پروگرام ترتیب دوں گا۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ نے اپنے اور بیگم صاحبہ کے بے ہوش ہونے کا جو واقعہ بتایا ہے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص سائنسی معلومات بھی رکھتا ہے۔'' پروفیسر ریاض نے کہا۔

''جی ہاں! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے...... بیگم کی ناک پر تو مجرم کے آدمی نے رومال بھی رکھا تھا، لیکن آخر میں کیسے بے ہوش ہو گیا تھا، یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہ آئی۔''

''آج کل ایسی چیزیں ایجاد ہو چکی ہیں جو انسان کے قریب کر دی جائیں تو ان میں سے ایسی شعاعیں خارج ہوتی ہیں کہ وہ بہت جلد اور غیر محسوس طور پر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہ شعاعیں ان چیزوں سے ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہیں، لیکن اگر اس پر ایک خاص قسم کا کاغذ ڈھانپ دیا جائے تو شعاعیں خارج نہیں ہوتیں۔ وہ جب کسی کو بیہوش کرنا چاہتے ہوں گے، بیہوش کرنے والی اس چیز سے کاغذ ہٹا دیتے ہوں گے۔ اس طرح دوسرا آدمی فوراً بیہوش ہو جاتا ہے۔''

''لیکن خود وہ بیہوش کیوں نہیں ہوتا...... کیا شعاعیں اس پر اثر نہیں کرتیں۔'' انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

''اس لیے کہ شعاعیں سامنے کی طرف سفر کرتی ہیں۔ جس طرح ہم ایک آئینے کو دھوپ میں رکھیں تو سامنے شعاعیں پڑتی ہیں اور لوگوں کی آنکھ خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن آئینے کو ہاتھ میں پکڑنے والا اس کی شعاع سے محفوظ رہتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا...... تو وہ کوئی اس قسم کا آلہ استعمال کرتے ہیں۔''

''ہاں! اور یہ آلہ انگوٹھی کے نگینے جتنا ہوتا ہے...... شاید انگوٹھی میں جڑا ہوتا ہوگا۔''

''اوہ!'' انسپکٹر جمشید چونکے...... ''مجھے یاد آگیا...... کار والے نوجوان کی انگلی میں ایک انگوٹھی موجود تھی۔''

''جب اس انگوٹھی کا ایک ڈھکنا یا خول بھی اس نے بنوا رکھا ہوگا تاکہ ضرورت نہ ہونے کے وقت وہ اسے ڈھانپ کر رکھے۔''

''ٹھیک ہے...... اب میں بالکل سمجھ گیا۔ ویسے آپ کے خیال میں ان شعاعوں سے آدمی کتنی دیر میں بے ہوش ہو جاتا ہے۔''

''بس تقریباً تیس سیکنڈ میں...... بعض حالتوں میں اس سے بھی کم وقت میں...... تھکا ہوا آدمی تو فوراً ہی بیہوش ہو سکتا ہے...... مثلاً کوئی دور سے دوڑتا ہوا آئے، وہ ہانپ رہا ہو اور اس جسم پر شعاع پڑ جائے تو وہ فوراً ہی بیہوش ہو جائے گا۔''

''ہوں...... ساری بات سمجھ میں آگئی...... تو پھر اس سے محفوظ رہنے کے لیے بھی کوئی چیز ضرور ایجاد کی گئی ہوگی۔''

''یقیناً...... لیکن اس سلسلے میں پروفیسر داؤد آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔''

کیونکہ میری لائن ذرا دوسری ہے اور اس موضوع پر میں نے کبھی تجربات نہیں کیے۔"

"خیر! میں ان سے بھی ملوں گا۔"

کار تیز رفتاری سے سفر طے کرتی ہوئی آخر شہر میں داخل ہوئی۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔

"بس اب آپ ہمیں اتار دیں...... یہاں سے ہم ٹیکسی پکڑ لیں گے۔"

"لیکن کیوں...... کیا میں آپ کو گھر تک نہیں پہنچا سکتا۔" پروفیسر ریاض نے مسکرا کر کہا۔ "اور پھر میں یہ بھی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے بچے تو خیریت سے ہیں...... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال بالکل غلط ہو اور انہیں کوئی حادثہ سرے سے پیش نہ آیا ہو۔"

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو......" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

ٹھیک دس منٹ بعد کار انسپکٹر جمشید کی گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ بریک لگتے ہی انسپکٹر جمشید تیزی سے نیچے اترے اور گھر کی طرف بھاگے۔ گلی میں گزرتے لوگ انہیں اس طرح بھاگتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پروفیسر ریاض اور بیگم جمشید بھی ان کے پیچھے داخل ہوئے۔

چند منٹ بعد انہیں یہ حقیقت معلوم ہو چکی تھی کہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔

☆☆☆

محمود اپنے خیالوں میں گم تھا کہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ آواز اس کمرے سے آ رہی تھی:

"اب تم کمرے سے باہر نکل کر اپنے بہن اور بھائی کو ایک نظر دیکھ لو...... کیونکہ اس کے بعد تمہیں میرے پاس آنا ہے۔"

"بہت اچھا!" محمود نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ دروازہ کیسے کھلے گا۔"

"ہینڈل پکڑ کر اپنی طرف کھینچو...... دروازہ کھل جائے گا۔"

"یہ تو میں پہلے بھی کر چکا ہوں......" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"جب تک میری مرضی نہ ہو، دروازہ نہیں کھلتا۔" آواز آئی۔

آخر محمود دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اس نے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی کے ذریعے اندر جھانک کر دیکھا...... وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فاروق پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا مگر اس کے ہنسنے کی آواز اس کے کانوں تک نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سوچا، شاید فاروق آواز پیدا کیے بغیر ہنسنے کی مشق کر رہا ہے...... ساتھ ہی اس نے فرزانہ کو دیکھا...... وہ بھی خوفزدہ انداز میں فاروق کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا، یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر زور سے دستک دی، انہیں آوازیں دیں، مگر ان دونوں کے کانوں پر تو جیسے جوں تک نہ رینگی۔ اب تو محمود بہت پریشان ہوا۔ اسے یہ بھی حیرت تھی کہ یہ دونوں یہاں کس طرح پہنچ گئے، یہ تو طاہر کی سالگرہ میں گئے ہوئے تھے۔

اچانک برآمدے میں وہی آواز اُبھری۔

"محمود! تمہاری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچے گی...... تم ان دونوں کو دیکھ چکے، یہی کافی ہے، اب تم میرے پاس آ جاؤ...... وقت ضائع کیے

نہ کرو......"

"مگر میں تمہارے پاس کس طرح آ جاؤں ...... مجھے کیا معلوم تم کہاں ہو......" محمود نے جھلا کر کہا۔

"فکر نہ کرو...... تم خود بخود میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی محمود کی طرف نہ جانے کس طرف سے سفید دھوئیں کی ایک لکیر تیر کی طرح آئی۔ محمود اس سے بے خبر تھا، اگر خبردار ہوتا تو بھی بچ نہیں سکتا تھا، کیونکہ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایک بار پھر اس کا سر زور سے چکرایا اور وہ فرش پر گرتا چلا گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک اور کمرے میں پایا ...... یہاں وہ موجود تھا، جو اسے اپنے گھر میں نظر آیا تھا اور جو اس سارے چکر کی وجہ تھا کمرے میں عجیب و غریب سائنسی آلات لگے ہوئے تھے۔ محمود کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا۔"

"بہت بہت شکریہ......" محمود نے اس طرح خوش ہو کر کہا جیسے اسے آزادی کی خوشخبری سنائی گئی ہو۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں کون ہوں اور کیا کام کرتا ہوں؟۔ اگر نہیں جانتے تو بتائے دیتا ہوں کہ میں ایک سائنسدان ہوں ...... لیکن سب لوگوں کا خیال یہ ہے کہ میں ملک کے لئے مفید کام کرتا رہتا ہوں۔ جب کہ اصل بات یہ ہے کہ میں اس ملک کا دشمن ہوں...... آج تک جو چیزیں بھی بنائیں، اس مقصد کے لئے بنائیں کہ اس ملک کو نقصان پہنچے، لیکن ظاہر میں ایسا نظر نہیں آتا...... اگر

...مثال میں ......
...ہو چکا ہوتا۔ اب یہ راز تمہیں معلوم ہے
...ہوتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے ایک
...ایجاد کیا تھا۔ اسے فصلوں پر آزمایا گیا تو میری خدمات کی تعریفوں کے
...دیئے گئے۔ اخبارات میں میری تصاویر شائع ہوئیں۔ اب کسی کو کیا پتا
کہ اس سفوف کی مدد سے بڑھنے والی پیداوار جب کھائی جائے گی تو پیٹ کی ان گنت بیماریاں ہوں گی اور اس طرح پوری کی پوری قوم بیماریوں کا شکار ہو جائے گی۔"

"کیا...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" محمود نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ابھی تو تم نے ایک مثال ایسی سنی ہے...... میں نے تو نہ جانے کون کون سی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جو ظاہر میں بہت مفید نظر آتی ہیں، لیکن اندرونی طور پر وہ لوگوں کی جڑیں کاٹ رہی ہیں۔"

"اوہ!" محمود بھونچکا رہ گیا۔ مارے خوف کے اس کا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔

"اب تم یہ پوچھو کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔" اس نے خوفناک انداز میں مسکرا کر کہا۔

"کیا کروں گا پوچھ کر...... میں تو اس قوم کے بارے میں سوچ رہا ہوں، جو تم جیسے شیطان صفت کے شکنجے میں ہے۔ مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ آخر اس قوم سے تمہیں دشمنی کیا ہے...... کیا تم خود اس قوم کے ایک فرد نہیں ہو......"

"یہی تو بات ہے...... میرا تمہاری قوم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں تو تمہارے دشمن ملک کا سب سے بڑا خیر خواہ ہوں...... اس ملک کی حکومت کے احکامات پر عمل کرتا ہوں۔"

''اوہ! تو تم غیر ملکی حکومت کے جاسوس ہو۔'' محمود کو دھکا سا لگا تھا یہ سن کر۔

''ٹھیک سمجھے...... اب سنو...... مجھے تین ذہین ترین نو عمر دماغوں کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم یہاں نظر آ رہے ہو...... جب میں نے ذہین ترین بچوں کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو تم تینوں نظر آئے۔ تمہاری ذہانت ثابت تھی اور پھر تم تینوں کی وجہ سے ہمیں نقصان بھی بہت پہنچا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا، کیوں نہ ایک پنتھ دو کاج کئے جائیں۔ بس پھر میں نے تمہیں اپنے پاس بلا لیا۔''

''تم ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو۔'' محمود نے پرسکون آواز میں کہا۔

''تم تینوں کے دماغوں سے یادداشت صاف کر دوں گا۔ پھر تمہارے دماغ بالکل ننھے منے بچوں کی طرح ہو جائیں گے۔ ان دماغوں میں میں جو بات چاہوں بٹھا سکتا ہوں...... بس میں ملک دشمنی کی باتیں تمہارے دماغوں میں ٹھونس دوں گا کہ تم اس قوم کا بیڑہ غرق کرنے پر تل جاؤ گے۔ تم جواب تک ملک اور قوم کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکے ہو، اب اس کے خلاف کام کرتے نظر آؤ گے اور آخر گرفتار کر لئے جاؤ گے۔ یہی تمہارا انجام ہوگا...... انسپکٹر جمشید بھی تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکے گا...... کہو کیسا پروگرام ہے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ محمود سکتے میں آ گیا۔ اس سے زیادہ خوف ناک پروگرام تو اس کے کانوں نے کبھی بھی نہیں سنا تھا۔

-----☆☆☆-----

جنگ چھڑ گئی

تین روز گزر گئے۔ شہر کا چپہ چپہ چھان مارا گیا۔ تمام جرائم پیشہ لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا کہیں دور دور تک پتا نہ تھا۔ بیگم جمشید کا بُرا حال تھا۔ انسپکٹر جمشید بھی بہت پریشان تھے۔ پھر بھی خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے محکمے کے لوگ اور دوست بھی بہت پریشان تھے، کچھ تو ان کے اتنے ہمدرد تھے کہ ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی اور وہ شہر میں تینوں بچوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ آئی جی صاحب، ڈی آئی جی صاحب اور اکرام کی حالت عجیب تھی۔ وہ بار بار فون کر کے انسپکٹر جمشید کو اپنی کوششوں کی اطلاع دیتے۔ محکمے کی طرف سے انسپکٹر جمشید کو ان دنوں چھٹی دیدی گئی تھی۔

پروفیسر داؤد اور خان رحمان بچوں سمیت اُن کے گھر آ گئے تھے۔ خان رحمان تو بیگم کو بھی لیتے آئے تھے تاکہ بیگم جمشید کا کچھ دل بہلے، مگر ایسے میں دل کو قرار کہاں...... بے چینی تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کوئی معمولی بچے تو تھے نہیں کہ کسی کی قید میں آرام سے پڑے رہتے، اُن کے واپس نہ آنے کا یہی مطلب تھا کہ وہ کسی کے بُری طرح قابو میں

آگئے ہیں۔

اس وقت وہ شام کی چائے پی رہے تھے۔ اچانک خان رحمان نے کہا:

''جمشید...... تم اس واقعے کا جائزہ شروع سے لو، شاید کوئی ایسی بات ذہن میں آجائے جس سے کوئی سراغ مل سکے۔''

''بہت غور کر چکا ہوں۔''

''پھر بھی...... ایک بار پھر جائزہ لینے میں کیا حرج ہے۔'' پروفیسر بولے۔

''یہ واقعہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب مجھے تار ملا۔ تار میں لکھا تھا کہ میرے چچا افتخار احمد انتقال کر گئے۔ میں نے فوراً وہاں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ دوسری طرف محمود اور فاروق سے معلوم ہوا کہ انہیں اپنے دوست طاہر کی سالگرہ پر جانا ہے اور یہ کہ وہاں کا پروگرام عشاء کے بعد کا ہے۔ میں نے انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا...... افتخار احمد ٹھہرے بہت دور کے رشتے دار، اس لئے بچوں کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے...... اسلئے میں نے انہیں اجازت دے دی، لیکن شرط یہ لگائی کہ تینوں میں سے ایک گھر میں رہے گا، چنانچہ محمود کو گھر میں رہنا پڑا...... میں بیگم کو لے کر حافظ آباد کے لئے روانہ ہوا اور فاروق اور فرزانہ پارٹی میں شرکت کیلئے۔ میں جب حافظ آباد پہنچا تو پتا چلا کہ افتخار احمد تو زندہ ہیں۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ کسی نے دھوکا دیا ہے...... اس کا مطلب یہی تھا کہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو خطرہ ضرور ہے...... سب سے زیادہ خطرے میں مجھے محمود نظر آیا...... اس لئے میں نے فوراً فاروق کو فون کیا کہ وہ فرزانہ کو لے کر گھر پہنچے......''

''اور یہی تمہاری غلطی تھی......'' خان رحمان بول اٹھے۔ ''تمہیں

چاہیے تھا کہ پولیس کو فون کرتے۔''

''ہاں...... شاید تم ٹھیک کہتے ہو...... ویسے میں نے یہی سوچا تھا کہ فاروق اور فرزانہ پولیس سے بہتر رہیں گے۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مجرم کس قدر چالاک ہے اور اس نے کتنا لمبا چوڑا منصوبہ بنایا ہے...... اس نے تو چھوٹی چھوٹی تفصیل تک پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب میں افتخار احمد کو زندہ دیکھوں گا تو فاروق اور فرزانہ کو فون کروں گا...... دونوں یہ سنتے ہی گھر کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ ادھر میں روانہ ہو جاؤں گا...... اس لئے وہ پہلے تیار تھا...... ایک طرف اس نے جنگل میں میرا راستہ روکا، دوسری طرف فاروق اور فرزانہ کو اس قابل نہ رہنے دیا کہ وہ محمود کی کوئی مدد کر سکتے۔ یہاں تک کہ خود فاروق اور فرزانہ بھی اس کے ساتھ غائب کر دئے گئے۔''

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم بے ہوش کس طرح ہو گئے تھے۔'' خان رحمان بولے۔

''اس کے متعلق تو میں بتا سکتا ہوں۔ یہ ایک آلے کی مدد سے بے ہوش کئے گئے تھے...... اس آلے سے شعاعیں خارج ہوتی ہیں۔''

''جی ہاں...... پروفیسر ریاض کا بھی یہی خیال ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''پروفیسر ریاض...... وہ تمہیں کہاں مل گیا۔'' پروفیسر داؤد نے چونک کر کہا۔

''اسی سڑک پر...... وہ حافظ آباد سے آگے کہیں گیا تھا۔ واپسی پر وہ صبح کے وقت اس جگہ سے گزرا تھا جہاں ہم کھڑے تھے۔ اس نے ہمیں

دی تھی۔"

"ہوں...... کیا ابھی تک تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی نہیں......" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"ذرا ذہن پر زور دو...... آخر مجرم کو یہ کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ دو بچے کسی سالگرہ پارٹی میں بھی جائیں گے۔ افتخار احمد کے انتقال کا پیغام تو اس نے خود دیا ہوگا۔ تمہارے بارے میں اسے معلوم تھا کہ تم حافظ آباد چلے جاؤ گے۔"

"ٹھہریے...... یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔" خان رحمان چونک کر بولے۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"آخر مجرم کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ حافظ آباد میں ان کا ایک رشتے دار بھی رہتا ہے۔" خان رحمان نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"اوہ!" کئی آوازیں اُبھریں۔ وہ حیران رہ گئے۔ یہ ایک بہت اہم سوال تھا۔

"واقعی اس پہلو کی طرف تو میرا دھیان گیا ہی نہیں۔" انسپکٹر جمشید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"اس طرح تو افتخار احمد شک کی زد میں آ جاتے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"وہ تو کل تک یہیں تھے۔ آج صبح ہی گئے ہیں...... بچوں کے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔" بیگم بولیں۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجرم نہیں ہو سکتے۔"

"سوال یہ ہے کہ اس کیس میں مجرم کون کون ہو سکتا ہے؟" خان رحمان بولے۔ "پہلے اس کا فیصلہ کیا جائے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اس کیس میں سب سے پہلے پروفیسر ریاض شک کی زد میں آتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کے بجائے پروفیسر داؤد بولے۔

"وہ کیسے؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"وہ اس طرح کہ آخر عین اس وقت وہ اس سڑک پر کیوں کر آ پہنچے...... جہاں تم دونوں کھڑے تھے۔"

"اس کا جواب تو انہوں نے دیا تھا۔ حافظ آباد سے بھی آگے اپنے کسی عزیز سے ملنے گئے تھے۔"

"اچھا تم بتاؤ...... تمہاری نظر میں کون کون شک کی زد میں آتا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"جہاں تک میرا خیال ہے...... اس کیس میں تین آدمیوں پر شک کیا جا سکتا ہے۔ نمبر ایک افتخار احمد، نمبر دو پروفیسر ریاض، نمبر تین طاہر کے والد خاور احمد۔"

"خاور احمد...... بھلا اسے کیوں لپیٹ رہے ہو۔" پروفیسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اسے بھی یہ معلوم تھا کہ بچے پارٹی میں شرکت کر رہے ہیں۔"

"لیکن اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ تم حافظ آباد جا رہے ہو......"

"یہی بات تو الجھن میں ڈال رہی ہے۔ خیر...... افتخار احمد میرے دور کے چچا ہیں، تینوں بچوں کو اغوا کر کے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا...... پھر بھی

ان پر شک کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے دور کے بچے لگتے ہیں...... پھر بھلا کوئی شخص کس طرح جعلی اطلاع دے سکتا ہے۔ رہے پروفیسر ریاض...... ان پر مجھے شک اس طرح ہوتا ہے...... کسی عجیب و غریب آلے سے مجھے بے ہوش کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارا واسطہ اس مرتبہ کسی سائنس دان سے آپڑا ہے اور وہی ایک ایسے سائنس دان نظر آتے ہیں جو اس واقعے کے دوران مجھ سے ملے۔ بعض لوگ خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے معصوم بن کر سامنے آجاتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک! میرا بھی یہی خیال ہے۔“ خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

پھر وہ سب اپنے اپنے خیالات میں کھو گئے۔ اچانک انسپکٹر جمشید اچھل پڑے۔ اُن کے چہرے پر بلا کی حیرت نظر آئی۔ انہوں نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا:

’اوہ! میں سمجھ گیا...... اب وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا...... مجھے پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی تلاشی لینی ہوگی۔“

☆☆☆

محمود کئی لمحوں تک اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اچانک اسے اس کی سخت آواز پھر سنائی دی۔

”میں فاروق اور فرزانہ کو بھی یہیں بلوا لیتا ہوں...... میں تم تینوں کو خوفزدہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھوں گا، تم کتنے دلیر ہو...... تمہارا حوصلہ کتنا بلند

پہنچتے ہوئے اس نے ایک بورڈ پر لگے ہوئے بیسیوں بٹنوں میں سے ایک کو دبایا۔ کمرے میں فوراً ہی آواز گونجی۔

”جی...... فرمائیے۔“

”باقی دونوں بچوں کو بھی میرے پاس بھیج دو۔“

”بہت اچھا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

چند منٹ بعد فاروق اور فرزانہ بھی وہیں نظر آئے۔ تینوں خوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور یوں ملے جیسے کئی سال کے بچھڑے ملتے ہیں۔ پھر جونہی ان کی نظر کمرے میں موجود اس آدمی پر پڑی، دونوں بھونچکے رہ گئے۔ پھر اپنی حالت پر قابو پانے میں انہوں نے دیر نہ لگائی۔

”کیا حال ہے محمود۔“ فاروق نے چہک کر کہا۔

”شکر ہے خدا کا...... تم سناؤ...... اتنا عرصہ کہاں رہے۔“ محمود بولا۔

”بس کیا بتاؤں...... جہاں دشمنوں نے رکھا، ہمیں رہنا پڑا۔“

”بہت خوب...... کہیں ان دنوں شاعری تو نہیں کرتے رہے۔“ محمود مسکرایا۔

”نہیں تو...... یہ کس نے کہہ دیا تم سے...... البتہ فرزانہ ضرور اس قسم کی کوشش فرماتی رہی ہے۔“

”بالکل جھوٹ...... بھلا میں کہاں اور شاعری کہاں...... یہ اپنے بس کا روگ نہیں۔“

”ہاں تمہارے بس کا روگ تو صرف جاسوسی ہے۔“ فاروق نے جل

کر کہا۔

"جلنے بھننے کی ضرورت نہیں ...... پہلے یہ سن لو کہ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"چلو بتا دو......"

تینوں کچھ اس طرح کھڑے باتیں کر رہے تھے جیسے اپنے گھر کے کمرے میں باتیں کر رہے ہوں۔ کمرے میں موجود اس خوفناک آدمی کو انہوں نے اس طرح نظر انداز کر دیا تھا جیسے اس کی ان کی نظروں میں کوئی اہمیت ہی نہ ہو ...... جیسے وہ اسے کچھ سمجھتے ہی نہ ہوں۔

"تو سنو ...... کمرے میں تمہیں جو صاحب نظر آ رہے ہیں، ہمیں اغوا کرنے والے یہی ہیں۔" محمود نے کہا۔

"ارے نہیں ...... تم جھوٹ کہتے ہو ...... یہ تو بہت نیک آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے، نماز روزے کے پابند بھی ہوں گے کیوں جناب ......" فاروق نے اس طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں بہت نیک ہوں ...... میری نیکی کا اندازہ تمہیں بہت جلد ہو جائے گا۔"

"شکریہ جناب ......" فاروق نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"اغوا کرنے کا مقصد سن کر تمہیں کانپنا اور تھرانا ہو گا۔" محمود نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ صاحب ہمیں تھر تھر کانپتے اور لرزتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"تو کیا انہوں نے ہمیں صرف اسی لئے اغوا کیا ہے۔" فرزانہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ان کی یہ خواہش تو ہم اپنے گھر میں بھی پوری کر سکتے تھے۔ اس کیلئے ہمیں یہاں تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں ...... یہ بات نہیں ...... ہمیں خوفزدہ دیکھنے کے علاوہ بھی یہ کچھ چاہتے ہیں۔" محمود نے بتایا۔

"کیا چاہتے ہیں۔ بات کو گھما پھرا کیوں رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے۔" فرزانہ جھلا اٹھی۔

"اگر تم سیدھی طرح سننا چاہتے ہو تو یوں ہی سہی ...... سنو ...... یہ صاحب ہمارے دماغوں کو بدلنا چاہتے ہیں۔" آخر محمود نے سرد آواز میں کہا۔

"دماغوں کو بدلنا چاہتے ہیں ...... بھئی واہ مزہ آ گیا۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"بھلا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے دماغ بدل جائیں۔ میرے دماغ میں فرزانہ کا دماغ رکھ دیا جائے، میرا دماغ تمہارے دماغ میں اور تمہارا دماغ فرزانہ کے دماغ میں ......" فاروق چہک کر بولا۔

"کیا دماغ وماغ لگا رکھی ہے ...... کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" محمود نے اسے گھورا۔

"ابھی نہیں چلا ...... ویسے یہ کوئی روپیہ نہیں کہ چلے۔" فاروق نے بھی برا سا منہ بنایا۔

"تو پھر کس طرح تبدیل کئے جائیں گے ...... بتاؤ بھی نا۔"

''ہمارے دماغوں کی یادداشتوں کی پلیٹیں صاف کی جائیں گی۔'' محمود نے بتایا۔

''بہت خوب! صفائی اچھی چیز ہے۔ آج تک ہم اپنے گھر، کپڑوں اور دوسری چیزوں کی صفائی کرتے اور کراتے رہے ہیں، لیکن کبھی ہمیں یادداشت کی پلیٹوں کی صفائی کا خیال نہیں آیا تھا ...... ہمیں تو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ یہ خود یہ تکلیف کریں گے اور ہمیں دھلی دھلائی پلیٹیں مل جائیں گی۔'' فاروق کہتا چلا گیا۔

''کہہ چکے ...... یا ابھی کچھ باقی ہے۔'' محمود نے تنگ آ کر کہا۔

''شکریہ ...... اب کیا کہوں گا ...... اب تو میں صرف اپنی یادداشت کی پلیٹ صاف ہونے کا انتظار کروں گا۔''

''احمق آدمی ...... یہ شخص ہماری یادداشت ضائع کر کے اپنی مرضی کے خیال ہمارے دماغوں میں بھر دے گا اور پھر ہم ...... جو اب تک اس ملک اور قوم کے لئے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلتے رہے ہیں۔ اس ملک اور قوم کے خلاف کام کرتے پھریں گے، پولیس ہمارے پیچھے ہو گی اور ابا جان بھی ہمیں نہ بچا سکیں گے۔'' محمود جلدی جلدی بتاتا چلا گیا۔ اسے ڈر تھا کہ فاروق کہیں پھر بات درمیان سے نہ اچک لے۔

''اُف ...... ارے!۔'' فاروق اور فرزانہ ایک ساتھ بول اٹھے۔

''یہ تو واقعی تھر تھر کانپنے اور لرزنے والی بات ہے۔'' فرزانہ نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

''ہاں یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔'' محمود بولا۔

''تو پھر آؤ ...... پہلے ذرا انہیں کانپ کر اور لرز کر تو دکھا دیں ...... ہو

سکتا ہے، یہ خوش ہو کر اپنا ارادہ بدل لیں۔'' فاروق نے کہا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ کمرے میں موجود شخص اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ اچانک وہ چیخا۔

''لے جاؤ انہیں ...... اور تینوں کو پہلی خوراک دے دو ...... تاکہ یہ آپریشن کے لئے تیار ہونا شروع کر دیں۔''

''پہلی خوراک ......'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں! دس دن تک تمہیں ہر روز ایک ایک خوراک دی جائے گی۔''

''کیا یہ مزے دار ہو گی۔''

''ہاں! ارگ کے ایک بیجے جتنی مزیدار ......'' اس نے مسکرا کر کہا۔

اور وہ سمجھ گئے کہ انہیں ہر روز کا ایک ٹیکہ لگایا جائے گا۔ اس مرتبہ انہیں ایک ہی کمرے میں رکھا گیا۔ پھر اچانک ان کے کمرے میں چھ آدمی گھس پڑے۔ تینوں کو دو دو آدمیوں نے جکڑ لیا۔

''ارے ارے! یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو ...... ہم قربانی کے بکرے تو نہیں ہیں۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

''چپ رہو ...... اگر کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے جان سے بھی مار سکتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے غرا کر کہا۔

''بالکل غلط! تم کسی کو جان سے نہیں مار سکتے ...... یہ کام تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے ...... وہ جسے چاہے زندگی دے، جسے چاہے موت دے ...... تم کون ہوتے ہو جان سے مارنے والے۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''بکواس مت کرو۔''

اس کے ساتھ ہی فاروق کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ لگا۔ فاروق

کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے سرد آواز میں کہا۔

''یہ تھپڑ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی فاروق نے ایک جھٹکا مارا اور ان دونوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بجلی کی طرح سے اچھلا اس کی ناک پر ٹکر دے ماری۔ جس نے تھپڑ مارا تھا۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے اندر ہوگیا۔ نہ صرف محمود اور فرزانہ، بلکہ پانچوں دشمن بھی بوکھلا اُٹھے۔ انکی بوکھلاہٹ سے محمود اور فرزانہ نے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اور خود کو چھڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ بس پھر کیا تھا۔ کمرے میں میدان جنگ کا نقشہ نظر آنے لگا۔

ایک طرف تین بچے تھے اور دوسری طرف چھ لمبے تڑنگے بدمعاش...... لیکن ان حالات میں بھی محمود، فاروق اور فرزانہ کے چہروں پر گھبراہٹ یا پریشانی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اچانک تینوں نے ایک ساتھ ان پر حملہ کر دیا۔

-----☆☆☆-----

فتح اور شکست

انسپکٹر جمشید کا جملہ سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ پروفیسر داؤد نے انہیں گھورا اور بولے۔

''کیا کہا تم نے...... پروفیسر ریاض کے گھر کی تلاشی لوگے...... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔''

''میں جانتا ہوں...... وہ آپ کے دوست ہیں۔ لیکن میں مجبور ہوں...... یہ میرے تینوں بچوں کا معاملہ ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے اُداس لہجے میں کہا۔

''غلط سمجھے! میں نے یہ بات اسلئے نہیں کہی کہ پروفیسر میرا دوست ہے، بلکہ اس لئے کہی تھی کہ اس کے گھر یا تجربہ گاہ کی تلاشی لینا آسان کام نہیں ہے۔ وہ ملک کا بڑا سائنس دان ہے۔ اس کے تعلقات بڑے بڑے آفیسروں سے ہیں۔ میرا خیال ہے، تمہیں تلاشی کا وارنٹ ہی نہیں ملے گا۔''

''کوئی پروا نہیں...... میں اس کی تجربہ گاہ کی تلاشی ہر حال میں لوں گا، اس کے لئے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔'' انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''آخر کس طرح......؟'' پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں...... بلکہ میں اسی وقت جا رہا ہوں...... وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔ نہ جانے محمود، فاروق اور فرزانہ کس حال میں ہوں......" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں......" خان رحمان بولے۔

"تم...... ہاں تم بھی آ جاؤ...... کوئی حرج نہیں...... پروفیسر صاحب آپ یہیں رہیں...... اگر آپ کی ضرورت پڑی تو ہم فون کر کے بلا لیں گے۔"

"ٹھیک ہے...... فکر نہ کرو...... اگر پروفیسر ریاض مجرم ہے تو اسے پکڑنا نہیں چاہئے...... اس کی تلاشی لینے کے لئے اگر تمہیں کوئی غیر قانونی کام بھی کرنا پڑے تو کر گزرنا...... میں دیکھ لوں گا۔" پروفیسر صاحب نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"شکریہ...... ایسا کرنا پڑا تو ضرور کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ خان رحمان کے ساتھ باہر نکل گئے۔ سب سے پہلے ڈی آئی جی صاحب کے پاس آئے جب انہیں معلوم ہوا کہ انسپکٹر جمشید، پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ دھک سے رہ گئے اور بولے:

"جمشید...... تمہارے بچے مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں۔ یوں بھی تینوں بچے قوم کے بہترین خادم ہیں۔ ان کے لئے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا پروفیسر ریاض کی تلاشی کے بغیر کام نہیں چل سکتا...... میرا مطلب ہے...... اگر تمہیں اس پر شک ہے تو کیوں نہ پہلے اس کی نگرانی کرائی جائے۔ پھر اگر شک یقین میں بدلتا نظر آیا تو ہم تلاشی لے سکیں گے۔ اس طرح ہم بعد میں کی جانے والی جواب دہی سے بچ جائیں گے۔"

"لیکن اس طرح بہت دیر ہو جائے گی۔ نہ جانے مجرم کا پروگرام کیا ہو...... ابھی تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ کہیں تینوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"تو پھر بہتر ہو گا کہ تم اس سلسلے میں آئی جی صاحب سے بات کر لو۔" انہوں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"جی بہتر......" انسپکٹر جمشید اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے بہت افسوس ہے...... مجھے معاف کر دینا جمشید میرے بچے......"

"میں سمجھتا ہوں جناب...... آپ رنجیدہ نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے۔ خان رحمان بھی ان کے ساتھ تھے۔ آئی جی صاحب نے بھی ڈی آئی جی صاحب کی طرح انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی انہیں بھی بہت افسوس تھا...... کیونکہ انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے انہیں بھی بہت عزیز تھے، لیکن شاید پروفیسر ریاض ان کی پہنچ سے باہر تھا۔

"میں تلاشی لوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"مگر کیسے......؟"

"تم دیکھ ہی لو گے...... کیا تم میرے ساتھ چلو گے۔" انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں چلوں گا...... کیا میں تمہارا دوست نہیں ہوں؟" خان رحمان نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"ہاں...... دوست ہو، لیکن سوچ لو...... یہ وہ مقام ہے جہاں آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب نے بھی مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

''وہ تمہارے افسر ہیں اور میں دوست ..... دوست اور افسر میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے، بچے پروفیسر کے ہاں سے برآمد نہ ہوں ..... اس صورت میں ہمیں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''تو کیا ہوا ..... تم مجھے ڈرا کیوں رہے ہو؟'' انہوں نے جھلا کر کہا۔

''میں ڈرا نہیں رہا ..... بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اکیلا پروفیسر ریاض کے ہاں جاؤں .....''

''اب یہ ناممکن ہے ..... خان رحمان اب تمہارے ساتھ جائے گا۔'' انہوں نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آؤ .....''

گھر سے وہ خان رحمان کی کار میں آئے تھے ..... اب کار کا رخ پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی طرف تھا .....

''لیکن کیا اس وقت وہ تجربہ گاہ میں ہوگا۔''

''اس کی تجربہ گاہ اور گھر ساتھ ساتھ ہیں، بلکہ یوں کہو کہ تجربہ گاہ اوپر ہے اور رہائش نیچے ہے .....'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''کیا تم پہلے وہاں جا چکے ہو .....''

''نہیں ..... لیکن یہ بات مجھے ضرور معلوم ہے۔''

ٹھیک دس منٹ بعد وہ تجربہ گاہ کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ گیٹ پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا چوکیدار کندھے پر بندوق رکھے کھڑا تھا۔

''ہمیں پروفیسر ریاض سے ملنا ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اب اچھا صاحب! آپ اپنے کارڈ دے دیں۔'' اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ چوکیدار نے خان رحمان کی طرف دیکھا۔

''کیا ایک کارڈ سے کام نہیں چلے گا۔'' خان رحمان نے پوچھا۔

''اگر آپ بھی پروفیسر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی کارڈ دینا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''اچھا .....''

چوکیدار دونوں کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ جلد ہی وہ واپس آیا اور ان دونوں کو اندر لے جا کر کمرے میں بٹھا دیا۔ پھر خود باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر ریاض اندر داخل ہوئے۔

''ہیلو انسپکٹر صاحب ..... اور خان رحمان صاحب .....''

دونوں نے اُٹھ کر پروفیسر سے ہاتھ ملائے۔

''فرمایئے ..... میں آپ کیلئے کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے کہا۔

''آپ اس روز ہمیں حافظ آباد والی سڑک پر ملے تھے ..... اور پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر گئے تھے۔ راستے میں میں نے آپ کو تمام واقعہ سنایا تھا۔ اس روز سے میرے تینوں بچے غائب ہیں۔''

''اوہ ..... یہ تو بہت افسوسناک خبر ہے۔'' پروفیسر کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں ..... اس سلسلے میں چھان بین کی جا رہی ہے ..... میں اس وقت آپ کی تجربہ گاہ اور کوٹھی کی تلاشی لینے آیا ہوں .....''

''کیا ..... میری تجربہ گاہ اور کوٹھی کی تلاشی۔'' پروفیسر ریاض اچھل پڑے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اس سلسلے میں جن لوگوں پر شک کیا جا رہا ہے، ان میں سے ایک آپ ہیں۔"

"لیکن میرا اس اغوا کے کیس سے کیا تعلق ——— اور مجھ پر شک کس بنا پر کیا جا رہا ہے۔"

"آپ عین اس وقت حافظ آباد کی سڑک پر سے کیوں گزرے جب کہ ہم وہاں کھڑے تھے، کیا یہ صرف ایک اتفاق تھا ——— اگر نہیں تو پھر اس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔"

"انسپکٹر آپ عجیب بات سنا رہے ہیں ——— خیر میں آپ کو بتا دوں کہ میری تجربہ گاہ اور کوٹھی کی تلاشی لینے کے لئے وزیر داخلہ کی اجازت درکار ہوگی ——— اگر تم ان کا اجازت نامہ لے آؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"لانے کو تو میں صدر مملکت کی اجازت بھی لا سکتا ہوں، لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے، اس لئے اجازت کے بغیر ہی اگر آپ تلاشی دے دیں تو بہتر ہوگا۔"

"افسوس ...... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن میرا خیال ہے، یہ ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر پروفیسر ریاض کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" پروفیسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پڑھ لیجئے ......" انسپکٹر جمشید بولے۔

پروفیسر نے کارڈ پر نظر ڈالی اور حیران رہ گئے۔ یہ کارڈ وزیر داخلہ کی

…رف سے انسپکٹر جمشید کو ملا ہوا تھا۔ اس کارڈ کی رو سے انسپکٹر جمشید کسی بھی جگہ …ے میں دخل انداز ہو سکتے تھے۔ کارڈ کو پڑھنے کے بعد پروفیسر کے منہ سے …نہ نکل سکا۔

"میرا خیال ہے، اب آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"ہاں! آپ تلاشی لے سکتے ہیں ——— لیکن آپ کا یہ کارڈ کینسل کرا دیا …ئے گا۔ میں وزیر داخلہ سے کہوں گا کہ آپ اس کارڈ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے …ہے تھے۔"

"ضرور کینسل کرا دیجئے گا ——— میں خود اس کارڈ سے تنگ آ گیا …ہوں ——— لیکن اس وقت میں تلاشی ضرور لوں گا۔"

"بڑے شوق سے۔" پروفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر جمشید اور خان رحمان نے پوری تجربہ گاہ چھان ماری، پھر کوٹھی کا ایک ایک کونا دیکھ ڈالا مگر محمود، فاروق اور فرزانہ کا انہیں کہیں نام و نشان تک نظر …نہ آیا ——— جب دونوں باہر نکل رہے تھے تو پروفیسر کی نظر ان کا مذاق اڑا رہی …تھیں۔ دونوں نے کوئی توجہ نہ دی اور باہر نکل آئے۔

"یہ کیا ہوا جمشید ———" خان رحمان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو ——— سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب کیا کرو گے۔"

"خاور احمد اور افتخار احمد کی بھی تلاشی لوں گا، لیکن اس سے پہلے ہم ذرا گھر چلیں گے ——— بیگم کو تسلی دینا بھی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے ......"

گھر سے فارغ ہو کر وہ خاور احمد کے ہاں گئے۔ خاور احمد انسپکٹر جمشید

کی بات سن کر بہت حیران ہوئے، لیکن انہوں نے تلاشی دینے پر کوئی اعتراض نہ
کیا۔ یہاں بھی کچھ نہ ملا۔ آخر دونوں حافظ آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ افتخار احمد
کا چہرہ انسپکٹر جمشید کی بات سن کر سرخ ہو گیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمشید...... میں تمہارا چچا ہوں...... مجھے تمہارے
بچوں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔''

''کیا کروں چچا جان...... سراغرسانی کے کام میں سب سے پہلا
اصول یہ ہے کہ کسی کو بھی شک سے بری نہ سمجھو...... اس واقعے کا تعلق ایک حد تک
چونکہ آپ سے بھی ہے، اس لئے تلاشی ضروری ہے۔''

''اچھی بات ہے...... تلاشی ضرور لو...... لیکن اس کے بعد میرے اور
تمہارے تعلقات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔''

''میں بعد میں آپ سے معافی مانگ لوں گا۔'' انسپکٹر جمشید اداس
انداز میں مسکرائے۔

''یہ میری مرضی ہے، میں معاف کروں یا نہ کروں۔'' افتخار احمد نے
منہ بنا کر کہا۔

''اچھی بات ہے۔''

آخر اس گھر کی بھی تلاشی لی گئی اور ناکامی ہوئی۔

☆☆☆

لڑائی اچانک اور سوچے سمجھے بغیر چھڑی تھی۔ فاروق کے منہ پر تھپڑ نہ
مارا جاتا تو اس وقت کمرے میں یہ جنگ نہ چھڑتی...... اس وقت یوں لگ رہا تھا

[illegible] ایک دوسرے [illegible] فاروق کی [illegible]
ناک پر لگی تھی جس نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ فوراً ہی اس کی ناک
سے خون بہہ نکلا اور یہیں سے لڑائی شروع ہوئی۔

محمود نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، اچھل کر ایک مکا اپنے قریب کھڑے
بدمعاش کے منہ پر دے مارا، فرزانہ نے ہوا میں ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ایک
بدمعاش کی کمر سے ٹکرائی۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گر گیا۔ اتنے میں تینوں بدمعاش
سنبھل چکے تھے۔ وہ ان تینوں پر جھپٹے۔ تینوں نے ایک ساتھ جھکائی دی اور
مچھلیوں کی طرح پھسلتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ بدمعاش چکرا کر
مڑے، لیکن مڑتے ہی ان میں سے تین کے پیٹوں پر زور سے ٹکریں لگیں اور
وہ گر گئے۔ دوسرے تین آگ بگولہ ہو کر آگے بڑھے اور محمود، فاروق اور
فرزانہ پر ٹوٹ پڑے۔ اس مرتبہ تینوں بچ نہ سکے۔ اور انہیں کچھ مکے اور لاتیں
قبول کرنا پڑے...... مکے اور لاتیں کھا کر انہیں جوش آ گیا۔ وہ سنبھل گئے۔
فاروق چہک کر بولا۔

''بھئی واہ! کیا شاندار ہاتھ تھے۔'' یہ کہتے ہی اس نے اپنی جگہ سے
چھلانگ لگائی اور ایک بدمعاش کی کنپٹی پر زور سے دو ہتھڑ مارتا ہوا آگے نکل گیا۔

''میں تو سمجھا تھا، یہ ہم سے مذاق کر رہے ہیں...... لیکن معلوم ہوتا ہے
مذاق کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں۔''

محمود نے کہا اور اس بدمعاش کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی جو
تھپڑ کھا کر فاروق کی طرف اچھلا تھا۔ وہ دھڑام سے اوندھے منہ گرا...... اس کا
سر فرش سے ٹکرایا اور ایسی آواز آئی جیسی ناریل کے ٹوٹنے کی آتی ہے۔

''محمود! تم ناریل توڑنے میں بہت ماہر ہو...... مان گئی میں تو۔''

فرزانہ نے کہا اور بجلی کی طرح اچھل کر ایک بدمعاش کی گردن کے ساتھ جھول گئی اور اس کا گلا گھونٹنے لگی۔

''ارے ...... ارے ...... مجھے بچاؤ ...... یہ شیطان کی خالہ تو میرا گلا گھونٹے دے رہی ہے۔'' اس نے بوکھلا کر کہا۔

''تمہارا گلا نہیں گھونٹے گی تو کیا تمہارا پھیپھڑے گھونٹے گی۔'' فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

باتوں کے ساتھ ساتھ وہ تتلی کی طرح ناچ بھی رہے تھے اور چھ کے چھ بدمعاشوں کو تگنی کا ناچ نچوا رہے تھے ...... چند منٹ بعد بدمعاش بے دم ہو کر فرش پر پڑے تھے۔ اور ان تینوں کو اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ اس دنیا کی نہیں، کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ اسی وقت کمرے میں وہی آواز گونجی۔

''بہت خوب ...... بہت شاندار ...... یہ مقابلہ بہت دلچسپ تھا۔''

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا ...... وہ یہ سوچ رہے تھے کہ آخر اس شخص نے ان کی لڑائی کس طرح دیکھ لی۔ وہ آوازیں تو سن سکتا تھا لیکن انہیں لڑتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ اچانک فرزانہ سمجھ گئی اور بولی۔

''اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں ...... ہوسکتا ہے اس کمرے میں کلوز سرکٹ کیمرے فٹ ہوں اور ان کے ذریعے وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہو۔''

''ضرور یہی بات ہے ......'' محمود بولا۔

''ہاں ...... تم ٹھیک سمجھے ...... میں بھی تمہیں ایک دلچسپ کھیل دکھاؤں گا ...... تم اسے دیکھ کر یقیناً خوش ہو گے۔'' آواز آئی۔

''کیا اس کھیل کو دکھانے کا پروگرام تم پہلے ہی بنا چکے ہو ......'' فرزانہ نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''نہیں تمہاری لڑائی دیکھنے کے بعد پروگرام بنایا ہے ...... انہیں میرے پاس واپس لے آؤ۔ میں اسی وقت انہیں کھیل دکھانا چاہتا ہوں۔''

چھ کے چھ بدمعاشوں نے اپنی جیبوں سے پستول نکال لیے اور ان کی طرف تان دیے۔ ایک بار پھر وہ اسی کمرے میں لئے جائے جا رہے تھے جہاں سے ابھی ابھی آئے تھے ...... جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

کمرے کے بیچوں بیچ ایک ننھا سا لڑکا کھڑا تھا۔ اور کمرے کے ایک کونے میں وہ شخص ایک طرف بیٹھا تھا۔ انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے کہا۔

''اگر تم تینوں اس ننھے سے لڑکے کو شکست دے سکے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر تجربہ کرنے سے پہلے تمہاری ایک ایک خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

تینوں نے اس لڑکے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا ...... انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ آخر اس لڑکے میں ایسی کونسی طاقت بھری ہے کہ ان تینوں کو اس سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

-----☆☆☆-----

سراغ

ایک ایک کرکے دن گزرتے جا رہے تھے اور محمود، فاروق اور فرزانہ کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ دوسری طرف پروفیسر ریاض نے انسپکٹر جمشید کی شکایت کر دی تھی۔ وزیر خارجہ نے انہیں بلا کر ساری بات معلوم کی تھی اور پھر صرف اتنا کہا تھا:

''پروفیسر ریاض سے الجھے بغیر اپنا کام کرتے رہو...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بچوں کے اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔''

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں جناب؟'' انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں نے اس سے پوچھا تھا...... اس نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے تو ان بچوں کو دیکھا تک نہیں۔''

''خیر دیکھا جائے گا، اگر وہ مجرم نہیں ہے تو میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اب تم کیا کرو گے بچوں کے سلسلے میں۔''

''میں جگہ جگہ چھاپے مارنے اور تلاشیاں لینے کے سوا کر ہی کیا سکتا

ہوں۔''

''ہوں...... میری اللہ سے یہی دعا ہے کہ بچے مل جائیں۔''

''شکریہ جناب۔'' انہوں نے کہا۔

وہ وہاں سے نکلے تو باہر اکرام ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے باہر ہی چھوڑ گئے تھے۔

''اب کہاں چلنا ہے؟''

''پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کی طرف جائیں گے۔''

''لیکن اس جگہ تو ہم پہلے بھی چھان بین کر چکے ہیں۔''

''ہاں، لیکن میں ایک بار پھر تجربہ گاہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''کیا پروفیسر ریاض اس کی اجازت دے دیگا۔'' اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اجازت دے یہ نہ دے میں تجربہ گاہ ضرور دیکھوں گا۔''

''بہت بہتر۔''

دونوں ایک بار پھر تجربہ گاہ کے پھاٹک پر پہنچے۔ وہی چوکیدار موجود تھا۔ وہ کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ پھر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر چلا گیا۔

''آخر تم مجھے تنگ کرنے پر کیوں تل گئے ہو۔'' پروفیسر ریاض کی آواز سن کر وہ چونک اٹھے۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ ملاتے ہوئے انسپکٹر جمشید نے کہا:

''مجھے افسوس ہے پروفیسر صاحب! میں ایک بار پھر تجربہ گاہ کی تلاشی لوں گا......''

''کیا مطلب ہے؟ کیا وزیر داخلہ نے تم سے بات نہیں کی۔''

"کی ہے جناب! لیکن ابھی تک انہوں نے میرا اجازت نامہ منسوخ نہیں کیا...... یہ دیکھئے...... ورنہ میں کبھی نہ یہاں آتا......" انہوں نے کارڈ نکال کر دکھایا۔

پروفیسر ریاض کے منہ سے کئی سیکنڈ تک ایک لفظ بھی نہ نکل سکا شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کس قسم کے آدمی سے واسطہ پڑ گیا ہے۔

"تم تلاشی لے سکتے ہو...... میں ایک بار پھر وزیر داخلہ سے بات کروں گا۔"

"ضرور کیجئے گا جناب۔"

اس مرتبہ انسپکٹر جمشید نے پوری تجربہ گاہ کے کمرے دیکھے۔ برآمدے دیکھے...... اکرام حیران تھا کہ وہ کیا دیکھتے پھر رہے ہیں۔ آخر اس سے رہا نہ گیا...... پوچھ ہی بیٹھا۔

"آخر آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟"

"باہر چل کر بتاؤں گا...... یہاں خاموش رہو۔" انہوں نے سرگوشی میں کہا......

ایک گھنٹے تک جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر جمشید باہر آ گئے۔ تجربہ گاہ کے باہر آ کر انہوں نے پوری تجربہ گاہ کا ایک چکر لگایا۔ اکرام کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انسپکٹر جمشید کیا کرتے پھر رہے ہیں۔

"آخر آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔" اکرام نے تنگ آ کر پوچھا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔" انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔

آخر پوری تجربہ گاہ کا چکر لگانے کے بعد وہ اکرام کی طرف مڑے۔

"چلو...... اب خاور احمد صاحب کے گھر لے چلو۔"

"خاور احمد صاحب جو نقشہ نویس ہیں۔" اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں...... ملک کے سب سے اچھے نقشہ نویس...... میرے اچھے دوست ہیں۔"

"لیکن ان سے کیا کام آن پڑا؟" اکرام نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اکرام، وقت نہیں ہے...... سوال بعد میں کرتے رہنا۔" انہوں نے کہا اور جیپ کی طرف بڑھ گئے۔

پندرہ منٹ بعد وہ خاور احمد کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ خاور احمد نے دو منٹ بعد دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے بولے:

"معاف کیجئے گا جمشید صاحب، میں ذرا کپڑے تبدیل کر رہا تھا...... اس لئے دروازہ کھولنے میں دیر ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں...... ہم آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔"

"تشریف لائیے...... اس وقت گھر میں سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ سب لوگ میرے بھائی کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔"

وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ انسپکٹر جمشید نے چند لمحے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اصل مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے چند پیمائشیں بتائیں۔ ایک رقبہ بتایا۔ کچھ کمروں کی لمبائی اور چوڑائی بتائی اور پھر بولا۔

"اب مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ اتنے رقبے میں اتنے لمبے چوڑے ک... کتنے کمرے بن سکتے ہیں۔"

"لیکن آخر یہ سب کس لئے پوچھ رہے ہیں۔" خاور احمد نے حیرا...

ہو کر کہا......''

''ایک کیس کے سلسلے میں ان معلومات کی ضرورت ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

''بہت بہتر! میں ابھی حساب لگاتا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور کاغذ پینسل سنبھال کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد خاور احمد نے جو جواب دیا، اس سے انسپکٹر جمشید کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ ابھی ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا تھا کہ خاور احمد بولے:

''معاف کیجئے گا...... میں ذرا ایک فون کر لوں۔'' خاور احمد یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

عین اسی وقت انسپکٹر جمشید بڑے زور سے اُچھلے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئے۔ اکرام نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید اس کمرے کے دروازے سے کان لگا چکے تھے جس میں خاور احمد فون کرنے گئے تھے۔

☆☆☆

''کیا آپ کا خیال ہے...... ہم تینوں اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔'' محمود نے ہنس کر کہا۔

''ہاں! یہ تم تینوں کو وہ ناچ نچائے گا کہ ہمیشہ یاد رکھو گے۔''

''بہت خوب...... پھر تو ہم یہ مقابلہ ضرور کریں گے تاکہ ہمیں یاد رہے......'' فرزانہ نے کہا۔

''چلو فاروق تم تنہا اس لڑکے سے مقابلہ کرو گے۔'' محمود نے کہا۔

''مجھے اس ننھے سے بچے سے لڑتے ہوئے شرم آتی ہے۔'' فاروق نے گھبرا کر کہا۔

''بزدل نہ بنو......'' محمود نے کہا۔

''بہت اچھا۔'' فاروق نے کہا اور اس ننھے بچے پر چھلانگ لگا دی۔

ان کا خیال تھا کہ وہ بچاؤ کے لئے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائے گا، لیکن اس نے تو ذرا بھر حرکت نہیں کی تھی۔ البتہ اپنی طرف آتے ہوئے فاروق کے سینے کی طرف مکا ضرور بڑھا دیا تھا۔ فاروق کے سینے سے مکا کیا ٹکرایا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سینے سے کوئی لوہے کا ایک من وزنی باٹ آ کر ٹکرایا ہو۔ وہ چیخ مار کر دوسری طرف الٹ گیا۔

یہ دیکھ کر محمود آگے بڑھا۔ اس نے خود کو بچاتے ہوئے لڑکے پر حملہ کرنے کی پوری کوشش کی مگر بچ نہ سکا۔ اس کے دائیں کندھے پر لڑکے کا مکا لگا اور اس کا حشر بھی فاروق جیسا ہوا۔ فرزانہ یہ سب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ لڑکا دائیں بائیں حرکت نہیں کرتا تھا۔ محمود کے گرتے ہی...... اس نے ایک چکر تیزی سے کاٹا اور لڑکے کی کمر پر پہنچ کر ایک بھرپور لات اس کی کمر پر ماری۔

دوسرے ہی لمحے لڑکا منہ کے بل زمین پر گرا اور پھر اسی طرح پڑا رہا۔

محمود، فاروق اور اس سائنس دان کا مارے حیرت کے برا حال ہو گیا۔

''بہت خوب...... تم بہت ذہین ہو، فوراً سمجھ گئیں کہ یہ انسانی بچہ نہیں، بلکہ سائنسی بچہ ہے جو صرف آگے کی طرف ہی وار کر سکتا ہے۔ پیچھے سے ہونے والے حملے سے خود کو نہیں بچا سکتا۔'' سائنس دان نے کہا۔

''بہر حال...... اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اب میں اس کی کمر پر بھی دو ہاتھ لگاؤں گا، لیکن اس طرح یہ انسانی بچہ نظر آ سکے گا۔''

''پھر بھی...... تمہاری یہ ایجاد ہے خوب۔'' محمود نے الجھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ فاروق کا بھی یہی حال تھا۔

''اس میں شرمندہ ہونے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی بھی آدمی شروع میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ انسانی بچہ نہیں ہے۔ اگر سب سے پہلے میں حملہ کرتی تو میرا بھی یہی حال ہوتا۔ بہر حال ہم یہ مقابلہ جیت گئے ہیں اور اب انہیں ہماری ایک ایک خواہش پوری کرنا ہوگی۔''

''ہاں ہاں...... ضرور'' اس نے کہا۔ اسی وقت پاس رکھے فون کی گھنٹی بجی...... اس نے ریسیور اٹھالیا اور پھر بڑے زور سے دھاڑا:

''کیا!؟''

وہ اسے اس طرح دھاڑتے دیکھ کر حیران رہ گئے...... فون کا ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ اچانک اس نے زور سے تالی بجائی۔ وہ چھ بدمعاش اندر داخل ہوئے جن سے تھوڑی دیر پہلے ان کی جنگ ہوئی تھی۔ اس نے بلند آواز میں کہا:

''خطرہ سر پر پہنچ چکا ہے۔ بچنے کی صرف ایک صورت ہے...... اور وہ یہ کہ ان تینوں کو مشینوں میں بند کر دو۔ مشینیں جو دوہری دیواروں والی ہیں۔ کوئی آکر کھلوائے گا بھی تو یہ دوسری دیوار کے پیچھے ہوں گے۔''

یہ کہتے وقت اس نے انگلی سے محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرف اشارہ کیا تھا......

-----☆☆☆-----

سُرنگ میں

دروازے سے کان لگاتے ہی انہیں خاور احمد کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی وہ فون میں کسی سے کہہ رہے تھے:

''ہیلو!...... پروفیسر...... انسپکٹر جمشید یہاں پہنچ چکا ہے۔ اس نے یہ بات بھانپ لی ہے کہ تمہاری تجربہ گاہ میں کچھ کمرے ایسے بھی ہیں جو دوسروں کی نظر سے اوجھل ہیں۔ اس نے کل رقبے، کمروں اور برآمدوں وغیرہ کے رقبے کا حساب لگا لیا ہے اور اب وہ یہ جانتا ہے کہ اتنے رقبے میں کتنے کمرے بن سکتے ہیں۔ میں نے اسے وہی تعداد بتائی ہے جو تمہاری تجربہ گاہ کے کمروں کی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کسی دوسرے نقشہ نویس کے پاس بھی جائے گا اور اس وقت ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔'' وہ خاموش ہو کر دوسری طرف سے جواب سننے لگا۔

انسپکٹر جمشید نے دروازہ کھولنے کے لئے ایک دھکا مارا، لیکن خاور احمد نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

''اکرام! آؤ دروازہ توڑ ڈالیں وقت بہت کم ہے۔''

یہ کہتے ہی انہوں نے پیچھے ہٹ کر دروازے پر اپنے کندھے سے

ایک ٹکر ماری اکرام نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ایک ساتھ دو آدمیوں کے کندھے دروازے سے ٹکرانے لگے۔ دوسری طرف خاور احمد کے ہوش اڑنے لگے تھے۔

اور جب دروازہ ٹوٹ کر دوسری طرف دھڑام سے گرا تو خاور احمد کمرے سے غائب تھا۔ البتہ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ دونوں بھاگتے ہوئے غسل خانے میں گھسے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں ایک اور دروازہ کھلا تھا جس کے ساتھ ہی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیڑھیاں اترنے لگے۔

اب وہ ایک سرنگ میں دوڑتے جا رہے تھے۔ کافی فاصلے سے انہیں دوڑتے قدموں کی آواز آ رہی تھی جو یقیناً خاور احمد کی تھی۔ سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے صاف محسوس کیا کہ سرنگ بالکل پختہ بنی ہوئی تھی۔ چھ فٹ اونچی اور چار فٹ چوڑی تھی۔ اس میں دو آدمی برابر چل سکتے تھے۔

''آخر یہ سب کیا ہے؟'' اکرام نے ہانپتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''اب اس کھیل کا آخری سین ہونے والا ہے۔ اس کے بعد تم سب کچھ جان جاؤ گے۔'' انسپکٹر جمشید کی آواز ایسے میں بھی پرسکون تھی۔ وہ ہانپ بھی نہیں رہے تھے۔

''نہ جانے اس سرنگ کا اختتام کہاں ہوگا۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ کر فائرنگ شروع کر دے۔'' اکرام نے خیال ظاہر کیا۔

''اس کے پاس پستول نہیں ہے...... اگر ہوتا تو وہ پہلے ہی سرنگ میں

رک کر فائر کر چکا ہوتا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''لیکن جناب...... سرنگ جس جگہ ختم ہوگی، اس جگہ بھی تو کوئی ہوگا اور یہ عین ممکن ہے کہ اس کے پاس پستول ہو۔''

''ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم واپس نہیں مڑیں گے، البتہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی رفتار بہت تیز کر دیں اور خاور کو پکڑ لیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اکرام بولا۔

اور دونوں نے اپنی رفتار بہت تیز کر دی...... اب وہ سرنگ میں سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ خاور نے بھی شاید قدموں کی آواز اپنے نزدیک محسوس کر لی تھی۔ اس لئے اب وہ بھی جان توڑ کر بھاگ رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ کی دوڑ کے بعد سرنگ کا آخری سرا آ گیا۔ اس بات کا علم انہیں اس طرح ہوا کہ انہوں نے ایک دروازہ کھلتا دیکھا۔ خاور اس میں سے گزرتا نظر آیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کر سکتا، انسپکٹر جمشید نے پوری قوت سے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دروازے میں سے ہوتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گئے۔

''بس! اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔'' انہوں نے کہا۔ اتنے میں اکرام بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ خاور نے انہیں بے بسی سے دیکھا اور سر جھکا دیا......

اچانک انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ وہ حیران رہ گئے...... وہ اس وقت پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ میں کھڑے تھے۔

☆☆☆

محمود، فاروق اور فرزانہ دہری دیواروں والی مشینوں کا ذکر سن کر بوکھلا اُٹھے۔ محمود چلایا:

''فاروق ..... فرزانہ ..... ہم مشینوں میں بند نہیں ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے ..... جیسے تمہاری مرضی .....'' فاروق نے ایسے انداز میں کہا جیسے اپنے گھر میں بیٹھے کسی کام کے سلسلے میں مشورہ کر رہے ہوں۔

''اگر ہم نہ چاہیں گے تو یہ کس طرح ہمیں بند کر سکتے ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''دیکھتے کیا ہو ..... انہیں بند کر کے تجربہ گاہ سے غائب ہو جاؤ ..... پھر کسی کے فرشتے بھی یہ معلوم نہ کر سکیں گے کہ ان تینوں کا کیا بنا ..... یہ کہاں گئے۔''

چھ کے چھ بدمعاش ایک دم ان کی طرف جھپٹے ..... روبوٹ بچہ ابھی تک اوندھے منہ پڑا تھا۔ کسی نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کیوں کہ وقتی طور پر وہ بے کار ہو چکا تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر جدوجہد شروع ہو گئی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی کوشش یہی تھی کہ مشینوں تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ وقت لگا دیں، دوسری طرف مجرم چاہتا تھا کہ وہ فوراً مشینوں کے اندر پہنچ جائیں۔

سب سے پہلے فاروق دو بدمعاشوں کے قابو میں آیا۔ وہ اسے گھسیٹ کر کمرے کے آخری سرے پر اس کو تین مشینوں کی طرف لے چلے۔

اچانک فرزانہ نے دوڑ کر فاروق کا ہاتھ پکڑ لیا ..... محمود نے جو فرزانہ کی یہ حرکت دیکھی تو خود بھی اس طرف جھپٹا اور فرزانہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چونکہ تم ہم تینوں کو الگ الگ مشین میں بند کرنا چاہتے ہو۔ اس لئے

اب تمہیں پہلے ہمارے ہاتھ چھڑانے ہوں گے .....'' فاروق نے مسکرا کر کہا۔

''بکومت .....'' ایک نے جھلا کر کہا۔

''جی بہت اچھا .....'' فاروق نے ڈر کر کہا۔

انہوں نے ان کے ہاتھ چھڑانے کے لئے پورا زور لگایا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

''بے وقوفو! یہ کر رہے ہو۔ چاقوؤں سے ان کے ہاتھ الگ کر دو۔'' سائنس دان نے غرّا کر کہا۔

بدمعاشوں کو بھی جیسے عقل آ گئی، فوراً ہی انہوں نے جیبوں سے چاقو نکال لئے۔ اب تینوں بے بس تھے۔ انہیں ایک دوسرے کے ہاتھ چھوڑنے ہی پڑے۔

''بہت خوب! اب انہیں چاقوؤں کے بل پر ہی آگے لے چلو۔ کہیں یہ گڑبڑ نہ کریں۔'' انہیں حکم دیا گیا۔

''اب کیا کریں فرزانہ .....'' محمود نے پوچھا۔

''چلو کوئی بات نہیں ..... اب ان کا اتنا بھی کیا دل دکھانا ..... ہو جاؤ بند مشینوں میں۔'' فرزانہ مسکرائی۔

وہ چاروں کو آگے لے جانے لگا۔ وہ چلنے کی بجائے گھسٹ رہے تھے پھر جونہی انہیں مشینوں میں دھکیل کر دروازے بند کئے گئے، کمرے میں ایک آواز گونجی۔

''خبردار کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے .....''

انہوں نے چونک کر دیکھا ..... انسپکٹر جمشید اور اکرام ہاتھوں میں پستول لئے کھڑے تھے۔ ان کے آگے خاور ہاتھ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

یہ دیکھ کر انہوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ پروفیسر ریاض نے گرج کر کہا:

''انسپکٹر! میں تمہارا بہت لحاظ کر چکا..... اب تم دیکھو گے کہ میں کیا ہوں..... ملک میں میری کتنی چلتی ہے..... میں ابھی وزیر داخلہ کو فون کر کے یہاں بلاتا ہوں..... انہیں بتاؤں گا کہ تم تیسری مرتبہ میری تجربہ گاہ میں آئے ہو۔''

''ضرور بلاؤ..... مگر نہیں..... تم نہیں..... میں بلاؤں گا..... تم ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے رہو گے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا اور میز پر رکھے فون سے نمبر ڈائیل کرنے لگے۔ انہوں نے ریسیور کان سے لگالیا اور جلدی جلدی پیغام دینے لگے۔ پروفیسر ریاض انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر انہوں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا:

''نہ صرف وزیر داخلہ بلکہ کچھ اور لوگ بھی آرہے ہیں۔ اب جو کچھ کہنا ان کے سامنے ہی کہنا۔''

☆☆☆-----

تین مشینیں

انہیں تقریباً آدھے گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔ آخر کچھ دیر بعد وہاں وزیر داخلہ، آئی جی صاحب، ڈی آئی جی صاحب، پروفیسر داؤد اور خان رحمان کے علاوہ پولیس کے کچھ آفیسر بھی جمع ہو چکے تھے اور سب حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔

''آخر بات کیا ہے جمشید..... تم نے ان لوگوں پر ریوالور کیوں تان رکھا ہے۔''

میں بتاتا ہوں رئیسانی صاحب..... ''پروفیسر ریاض نے انسپکٹر جمشید کے بولنے سے پہلے کہا۔ وزیر داخلہ رئیسانی کہلانا پسند کرتے تھے۔

''چلئے..... آپ ہی بتایئے۔''

پروفیسر نے خوب نمک مرچ لگا کر انسپکٹر جمشید کے دو مرتبہ تلاشی لینے کے بارے میں بتایا۔ اور یہ بھی کہ اب تیسری مرتبہ آئے تھے۔ اس طرح کے پستول ان کے ہاتھوں میں تھے۔

''لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ہم کس راستے سے آئے ہیں۔ اور یہ صاحب کون ہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے خاور کی طرف اشارہ کیا۔

"بات کیا ہے؟" وزیر داخلہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی بات صرف اتنی سی ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔"

"کیا کہا؟"

کیا کی آواز سے ہال گونج اٹھا...... وہ انسپکٹر جمشید کو گھورنے لگے۔

کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ آخر وزیر داخلہ نے کہا:

"جمشید! تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تینوں بچے یہاں ہیں؟ کیا تمہیں یقین ہے؟"

"جی ہاں جناب...... میں جب اس کمرے میں داخل ہوا تو میں نے ان چھ بدمعاشوں کو ان تین مشینوں کے پاس کھڑے بری طرح ہانپتے دیکھا تھا۔ پروفیسر ریاض سے کہیے...... وہ یہ مشین کھول کر دکھائے۔"

"ٹھیک ہے...... اگر بچے یہاں نہیں ہیں تو پروفیسر صاحب آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" ڈی آئی جی صاحب نے جلدی سے کہا۔

"ضرور ضرور...... میں تیار ہوں......" یہ کہہ کر پروفیسر ریاض مشینوں کی طرف بڑھے اور باری باری ان تینوں مشینوں کو کھول ڈالا۔ سب لوگ یہ دیکھ کر چونک اُٹھے کہ مشینیں اندر سے خالی تھیں...... بس کل پرزے ہی نظر آ رہے تھے۔

"جمشید...... یہ کیا...... بچے تو یہاں نہیں ہیں۔" آئی جی صاحب کے منہ سے نکلا۔

ایک لمحے کے لئے انسپکٹر جمشید بھی گھبرا گئے۔ پھر وہ آگے بڑھے۔ ان کی نظریں کمرے کے فرش پر تھیں۔ وہ غور سے فرش کا جائزہ لے رہے تھے یہاں تک کہ وہ مشینوں کے پاس پہنچ گئے اور سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

"میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بچے ان مشینوں میں ہیں۔"

کمرے میں موجود لوگوں نے یہ جملہ سن کر انسپکٹر جمشید کو اس طرح گھورا جیسے ان کا دماغ خراب ہو گیا ہو...... وزیر داخلہ نے برا سا منہ بنا کر کہا:

"کیا کہتے ہو...... اگر بچے مشینوں میں ہی ہیں تو پھر دکھائی کیوں نہیں دے رہے؟"

"اس کا جواب میں دوں گا۔"

اچانک ایک اور آواز گونجی...... سب نے مڑ کر دیکھا...... یہ پروفیسر داؤد تھے۔ وہ پروقار انداز میں چلتے ہوئے مشینوں کی طرف بڑھے اور پھر ذرا جھک کر بولے:

"کیا مجھے اجازت ہے؟"

"جی ہاں...... کیوں نہیں...... اگر آپ اس مسئلے کو حل کر دیں تو اور کیا چاہیے۔" آئی جی صاحب بول اُٹھے۔

"تو پھر سنئے...... یہ مشینیں دماغ بدلنے کی مشینیں ہیں۔ میں ان سے اور ان کے کام سے اچھی طرح واقف ہوں...... ان میں دہری دیواریں لگائی جاتی ہیں......"

"دماغ بدلنے کی!!" کئی آوازیں اُبھریں۔

"ہاں! آپ کو اس مشین میں بند کر کے اگر کچھ بٹن دبا دیئے جائیں تو پھر خود بخود یادداشت کی پلیٹ صاف ہو جائے گی اور اس پلیٹ پر اپنی مرضی کے خیالات محفوظ کئے جا سکتے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"تو...... تو کیا محمود، فاروق اور فرزانہ کی یادداشت......" انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ ان کا رنگ فق ہو گیا۔

"نہیں...... ابھی بٹن نہیں دبائے گئے...... تم عین وقت یہاں پہنچ گئے شاید......" پروفیسر داؤد نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر خدا کے لیے ان مشینوں کو کھول ڈالیے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

پروفیسر داؤد نے کچھ بٹن دبائے اور پھر انہوں نے دیکھا... تینوں مشینوں میں محمود، فاروق اور فرزانہ بند تھے۔ وہ بیہوشی کی حالت میں اس طرح کھڑے تھے جیسے بت ہوں۔ انہیں باہر نکالا گیا۔ اب سب پروفیسر ریاض کو گھور رہے تھے۔ وزیر داخلہ کا حال سب سے برا تھا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ پروفیسر ریاض کے چیتھڑے اُڑا دیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا دوست اور ملک کا مشہور سائنس دان ایک مجرم بھی ہو سکتا ہے۔

پروفیسر داؤد کی کوشش سے تینوں بچے جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ ان کی نظریں جونہی ان سب پر پڑیں، وہ حیران رہ گئے۔ خاور احمد کو وہاں ہاتھ اُٹھائے دیکھ کر تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ محمود نے کہا:

''ابا جان...... یہ ہمارے دوست کے والد یہاں ہاتھ اٹھائے کیوں کھڑے ہیں۔ کیا یہ بھی پروفیسر ریاض کے ساتھی ہیں؟''

''ہاں بیٹا! یہ اور پروفیسر ریاض دونوں دشمن ملک کے جاسوس ہیں ملک کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ اس سے پہلے نہ جانے کیا کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ انہیں یہ حکم ملا تھا کہ تم تینوں کو اغوا کر کے تمہارے ذہن بدل دیے جائیں تاکہ میں تمہارے غم میں پاگل ہو جاؤں اور ان کے راستے کا کانٹا نکل جائے۔ کیونکہ انہیں میری طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ تمہیں اغوا کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ باقاعدہ پروگرام بنایا گیا۔ خاور صاحب نے بیٹے کی سالگرہ کی تاریخ مقرر کر دی۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی انہوں نے سالگرہ نہیں منائی تھی۔ حافظ آباد سے ایک تار افتخار احمد کے نام سے دیا گیا۔ تاکہ میں وہاں روانہ ہوں اور بچے خاور کے ہاں چلے جائیں۔ تاکہ اسی جگہ سے تمہیں غائب کر دیا جائے۔''

''اسی جگہ سے کیا مطلب؟'' فرزانہ نے چونک کر پوچھا۔

''خاور کے کمرے کے غسل خانے میں ایک سرنگ کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ سرنگ یہاں تک آتی ہے۔ دونوں کوٹھیوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''اوہ...... تو اسی لئے سالگرہ والے روز میں نے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سنی تھی...... خاور صاحب شاید اس وقت نہانے کے بجائے یہاں آئے ہوئے تھے۔'' فرزانہ کو یاد آ گیا۔

''ضرور یہی بات ہو گی...... بہر حال انہیں جب معلوم ہوا کہ تم تینوں کے بجائے دو سالگرہ میں شریک ہو رہے ہیں تو خاور کو فوراً سرنگ کے ذریعے پروفیسر ریاض کے پاس آنا پڑا تھا تاکہ محمود کا کچھ کیا جا سکے۔ عین اس وقت میں نے حافظ آباد سے فون کیا۔ ادھر یہ واپس آ گئے۔ میرے فون کی وجہ سے تم دونوں کو اسی گھر سے اغوا نہ کیا جا سکا...... ورنہ پروگرام تو یہی تھا کہ پارٹی کے ختم ہونے کے بعد تم تینوں کو غسل خانے کے راستے سے غائب کر دیا جائے گا...... لیکن ہوا اُلٹ...... میں ان کی اُمید سے بہت پہلے حافظ آباد پہنچ گیا اور وہاں جا کر معلوم ہوا کہ افتخار احمد تو زندہ ہیں...... بس میں نے فوراً فون کر دیا۔ تم دونوں کے گھر میں پروفیسر خود ہی پہنچ چکے تھے۔ ان کے ساتھی مکان سے باہر تھے۔ محمود کو پہلے ہی بے ہوش کیا جا چکا تھا۔ اس کے پاس بے ہوش کرنے کے آلے موجود ہیں، جن سے شعاعیں نکلتی ہیں اگر آدمی تھکا ہوا ہو تو شعاعیں بہت جلد اثر کرتی ہیں...... یہ بات مجھے خود پروفیسر نے بتائی تھی۔ ہم افراتفری میں حافظ آباد سے روانہ ہوئے تو راستے میں رکاوٹ کھڑی کی گئی۔ میری کار اُڑا دی گئی۔ یہ باتیں میں بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا...... خیر...... صبح سے پہلے میں جنگل سے روانہ نہ ہو سکا...... صبح سویرے پروفیسر ریاض آتے نظر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ حافظ آباد سے آگے ایک

جگڑ گئے تھے۔ ان سے لفٹ لی گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ یہ تھی کل کہانی...... اب رہا یہ سوال کہ انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ افتخار میرے رشتے دار ہیں...... تو یہ بات مجھے بعد میں یاد آئی...... کئی سال پہلے کی بات ہے...... افتخار احمد کو ایک مکان کا نقشہ بنوانا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ذکر کیا...... میں نے انہیں خاور احمد کے پاس بھیج دیا۔ اس طرح خاور احمد کو معلوم تھا کہ وہ میرے رشتے دار ہیں۔ میں نے ان تینوں کی تلاشی لی تھی۔ لیکن تم تینوں کا پتہ نہ چلا تھا۔ میرا اطمینان نہ ہوا، میں نے ایک بار پھر پروفیسر ریاض کی تجربہ گاہ کا جائزہ لیا...... اس وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ کہیں تجربہ گاہ میں کوئی خفیہ کمرہ تو نہیں...... اس خیال کے پیش نظر میں نے تمام کمروں کی اپنے قدموں کے ذریعے پیمائش کی اور کل رقبے کا اندازہ لگایا۔ پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ جتنے کمرے ہونے چاہئیں اس سے کم ہیں...... بالکل صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے خاور صاحب کے پاس گیا کیونکہ یہ بہت ماہر نقشہ نویس ہیں...... اور جب انہوں نے وہی تعداد بتائی جو تجربہ گاہ کے کمروں کی تھی تو میں بہت مایوس ہوا۔ عین اسوقت مجھے یاد آگیا کہ خاور کو یہ معلوم ہے کہ افتخار احمد میرے رشتے دار ہیں۔ بس پھر کیا تھا، پورا نقشہ میرے ذہن میں صاف ہوگیا۔ کڑی سے کڑی مل گئی۔ دوسری طرف خاور فون کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا...... ہم بھی کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہوگئے۔ اور ہم نے سنا یہ پروفیسر ریاض کو بتا رہا تھا کہ میں ان کے گھر پہنچ گیا ہوں...... ہم نے دروازہ توڑنا شروع کیا تو یہ سرنگ کا دروازہ کھول کر بھاگ نکلنے ہوا۔ آخر ہم بھی یہاں پہنچ گئے...... اگر تجربہ گاہ کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو آپ لوگ میرے فون کرنے کے باوجود یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے...... آپ باہر نکل کر اس کمرے کا دروازہ بند کر کے دیکھ لیں...... آپ کو باہر سے اس کمرے کا نام ونشان تک نظر نہیں آئے گا......"

انسپکٹر جمشید کی کہانی سن کر سب دنگ رہ گئے۔ پھر انہوں نے باہر نکل کر دروازہ بند کر کے دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب ان کے سامنے صرف ایک دیوار تھی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے...... ہم تو یہ سوچ رہے تھے، بس اب ہمارے دماغ الٹ جائیں گے اور ہم اپنے ملک اور قوم کے خلاف کام کرتے پھریں گے۔ پھر ابا جان ہمیں گرفتار کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کریں گے اور اس طرح ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں گے۔ لیکن اللہ کی قدرت تو دیکھئے کہ اب سلاخوں کے پیچھے وہ نظر آئیں گے جو اس ملک میں بہت بڑی حیثیت کے آدمی ہیں...... جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے" فاروق کہتا چلا گیا۔

"ارے ہم اسے تو بھول ہی گئے۔" اچانک محمود کے منہ سے نکلا۔

"کسے؟" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اس روبوٹ بچے کو......"

"روبوٹ بچہ...... کیا مطلب......" کئی آوازیں اُبھریں۔

اور وہ روبوٹ بچے سے اپنی لڑائی کی تفصیل سنانے لگے جس پر خوب قہقہے لگے اور اس طرح یہ چکر ختم ہوا۔

☆☆☆